امام احمد بن حنبل
رحمۃ اللہ علیہ
نصر اللہ خاں عزیز
مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور

امام احمد بن حنبل
رحمۃ اللہ علیہ
نصر اللہ خاں عزیز
مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور

50/2

رفیع الدین ہاشمی

لاہور ۲۹؍دسمبر ۱۹۷۱ء

امام احمد بن حنبلؒ

نصر اللہ خان عزیز

مکتبہ تعمیر انسانیت موچی دروازہ لاہور
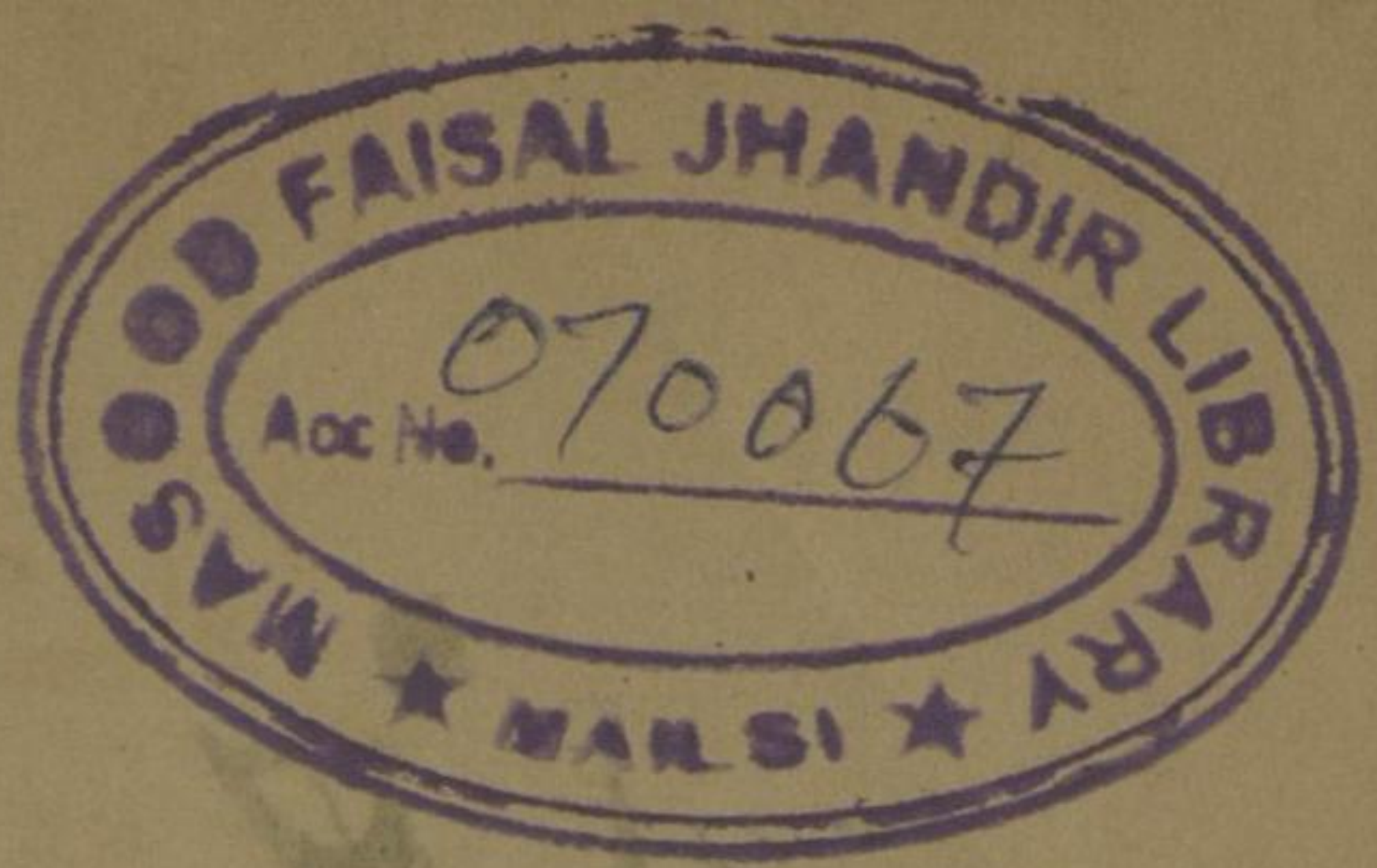
ناشر۔ شیخ محمد قمر الدین پروپرائٹر مکتبۂ تعمیر انسانیت لاہور
و ناشر تفہیم القرآن

سن اشاعت . . . ۱۹۵۹ء

ضخامت . . ۱۱۲ صفحات

قیمت . . ایکروپیہ آٹھ آنے

طابع اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور

حرفِ اوّل

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی سے مجھے اپنی زندگی کی ابتدا ہی میں دلچسپی پیدا ہو
گئی تھی۔ میں نے جب شعور و احساس کی آنکھ کھولی تو دو چیزوں نے میری تمام توجہات اپنی طرف
مبذول کرلیں۔ ایک یہ اعتقاد کہ اسلام دینِ برحق ہے اور ایک مسلمان کا یہ فرضِ زندگی ہے کہ
اس کی پیروی کرے خواہ اس پیروی میں اسے زندگی کی ہر راحت سے محروم ہونا پڑے۔ کیونکہ
اس پیروی ہی میں انسان کی اخروی نجات اور دائمی مسرت پوشیدہ ہے۔ اگر اخروی نجات و
مسرت حاصل ہوگئی تو دنیوی زندگی کی تمام کلفتوں کی تلافی ہوگئی۔ لیکن اگر اس زندگی میں خدا
کی نافرمانی کرکے انتہائی مسرتیں بھی سمیٹ لی گئیں اور اُخروی زندگی کی نعمتوں سے محرومی ہوگئی
تو اس سے بڑی مصیبت اور محرومی اور کوئی نہیں؛

دوسرے غلامی کا جانگسل احساس اور انگریزوں کے تسلط سے نجات حاصل کرنے
کی تڑپ۔ سلاطین و امراء نے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم میرے دل کو کبھی اپیل نہ کیا اور ہمیشہ
ان کے وجود کو ملتِ اسلامیہ کے زوال و ادبار کا سب سے بڑا سبب سمجھا گیا؛

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے عظیم ترین کارناموں میں میرے ان دونوں
ذوقوں کی تسکین کا سامان تھا۔ انہوں نے کتاب و سنّت کی ٹھیٹ پیروی کا مسلک دنیا کے
سامنے پیش کیا اور انہوں نے حق کی حمایت میں سلاطین و امراء کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی
مجھے شروع ہی سے احساس تھا کہ حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ نے جو جنگ چار خلفائے عباسی
سے لڑی وہ محض مسئلہ خلقِ قرآن کی کلامی یا اعتقادی یا فقہی نوعیت کے لیے نہیں تھی۔
بلکہ اس اصل الاصول کے لیے تھی جو دینِ حق کی بنیاد ہے کہ خدا کے دین کی اتباع کرنے کا مطلب

کتاب و سنت ہے۔ کوئی شخص خاص کلی افتاد طبع یا کسی زمانے کا فلسفی مزاج نہیں۔ سوال یہ نہیں تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا نہیں بلکہ یہ تھا کہ خلفائے عباسی کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ایک عقیدہ اختیار کریں اور پھر اسے حکماً مسلمانوں پر مسلط کریں۔ دین حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکمل ہو چکا۔ اس کی تعبیر کتاب و سنت کی روشنی میں کی جا سکتی ہے۔ کسی شخص کا یہ حق نہیں کہ وہ ایک بات طے کرے اور پھر لوگوں سے کہے کہ اسے مانو ورنہ تم مشرک یا کافر ہو۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی یہ خصوصیات سیرت تھیں جن کی بنا پر جب مجھے ۱۹۵۸ء میں انہی کی طرح قید کی فراغتیں نصیب ہوئیں تو میں نے ان کی زندگی کا یہ خلاصہ مرتب کیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کا مطالعہ اتباع دین حق کا داعیہ پیدا کرنے میں معاون ہو اور میرے لیے حسنات آخرت کے حصول کا موجب۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم

۲۳ اکتوبر ۱۹۵۸ء

نصر اللہ خان عزیز

امام احمد بن حنبل رح

امام احمد بن حنبلؒ

امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا مقام ائمہ ہدیٰ کی تاریخ میں خصوصی امتیاز رکھتا ہے۔ ابتدا سے آخر تک ان کی زندگی افرادِ امت کے لیے نمونہ ہے۔ وہ اوّل سے آخر تک آزمائے گئے۔ مگر کسی منزل میں بھی ان کا قدم نہیں ڈگمگایا۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے صبر ایوب، استقامت یوسفؑ، محبت ابراہیم اور جلال موسیٰ عطا کیا تھا۔ اور ان اوصاف سے کام لے کر انہوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو برپا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ کتاب وسنت کا اجراء اور دین کا احیا ان کا نصب العین تھا۔ اس نصب العین کو انہوں نے پایہ تکمیل تک پہنچا کے چھوڑا۔ آج کتاب وسنت کی پیروی کا جتنا کچھ چرچا ہے اس کی داغ بیل ڈالنے کا سہرا اسی جلیل القدر امام کے سر پہ ہے۔

امام کی اخلاقی عظمت

انسان کی آزمائش کی تین ہی صورتیں ہیں یہ اس پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جائیں

اس پر انعام و اکرام کی بارش کی جائے۔ اور خلق اسے شہرت کے فتنے میں مبتلا کرے۔ حکومتوں کا ظلم و ستم انسان کو مرعوب کر کے راہ حق سے ہٹاتا ہے انعام و اکرام سے انسان پر مداہنت طاری ہو جاتی ہے۔ اور محبوبیت عوام آدمی کو مغرور کر کے گمراہ کرتی ہے۔ امام موصوف پر تین خلفاء نے مسلسل ظلم کیا مگر وہ نہ دبے۔ ایک عباسی خلیفہ نے ان پر انعامات کی بارش کی مگر وہ نہ جھکے۔ اور خلق نے فتنہ شہرت میں ان کو مبتلا کیا مگر وہ نہ بہکے۔ ان کی عظمت اخلاق کی قیمت دینے والا کوئی نہ نکلا۔ اور حق یہ ہے کہ جو خدا کا ہو جاتا ہے پھر اسے کوئی نہیں خرید سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ

اپنی زندگی میں ہی وہ اس وقت کے پورے عالم اسلام میں مشہور ہو گئے تھے۔ اور ان کے صلاح و تقویٰ پر تمام ممالک اسلامی کے عوام و خواص گواہ تھے۔ ابن جوزیؒ ابو ثور کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ احمد بن حنبلؒ اہل جنت میں سے ہیں۔ تو اس نے غلط بات نہیں کی۔ اس لیے کہ اگر کوئی آدمی خراسان اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں جائے تو اس سے لوگ کہیں گے کہ احمد بن حنبل مرد صالح ہے۔ اسی طرح شام میں جائیے تو لوگ پکار اٹھیں گے احمد بن حنبل مرد صالح ہے اور اگر عراق میں جا کر دریافت کیجئے تو وہاں بھی یہی قول سنائی دے گا کہ احمد بن حنبل مرد صالح ہے۔ الغرض ان کے

صلاح و تقویٰ پر زمانے کا اجماع ہو چکا ہے۔

تاریخ ولادت

امام احمد بن حنبل ربیع الاول سنہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی تاریخ ولادت کی طرح ان کی تاریخ ولادت میں کوئی اختلاف نہیں۔ کیونکہ خود امام نے اپنے بیٹے سے اس کی روایت کی۔ اسی طرح ان کی تاریخ وفات بھی معلوم عوام ہے۔ ان کی وفات کا سانحہ بغداد کی تاریخ کا ایک مشہور واقعہ تھا۔ ان کے جنازے میں آٹھ لاکھ آدمیوں نے شرکت کی۔ اور اس کی اطلاع ساری اسلامی دنیا میں پھیل گئی تھی۔

حضرت امام بغداد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مرو میں رہتے تھے۔ مگر ان کی والدہ زمانہ حمل میں بغداد چلی آئیں اور یہیں وہ مرد حق پیدا ہوا۔ جس نے چالیس برس تک پوری دنیا میں علم و عمل کا غلغلہ بلند رکھا۔

قومیت و نسب

امام احمد عربی نژاد ہیں۔ اور نسباً شیبانی ان کی ماں اور باپ دونوں قبیلہ شیبان سے متعلق تھے۔ ان کا نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نزار بن معد بن عدنان میں جاکر مل جاتا ہے۔ یہ قبیلہ عزم و ہمت، غیرت و شجاعت اور حمیت و استغنار میں معروف تھا حضرت مثنیٰ بن حارثہ اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جن کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عراق پر حملے کے وقت جیوشِ اسلامی کا سالار مقرر فرماکر بھیجا تھا۔ قبیلہ شیبان اسلام سے پہلے بھی عزم و استقلال میں مشہور تھا۔ اور اسلام لانے کے بعد بھی اس کی یہ خصوصیات

قائم رہیں۔ بلکہ اسلام نے ان کو صیقل کر کے اور زیادہ روشن کر دیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ قبیلہ بصرہ میں آکر آباد ہو گیا تھا۔ امام احمد کا آبائی وطن اس لحاظ سے بصرہ ہے۔ چنانچہ جب وہ ایک مرتبہ بصرہ آئے تو انہوں نے بنو شیبان کی مسجد مازن میں نماز پڑھی۔ اور فرمایا کہ یہ میرے خاندان کی مسجد ہے۔

خاندانی حالات

امام احمد کے والد کا نام محمد بن حنبل تھا۔ اور ان کے دادا حنبل بن ہلال تھے۔ جو بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے تھے۔ اور بنو امیہ کے عہد میں سرخس کے حاکم تھے۔ جب اس نواح میں عباسی حکومت کا چرچا ہوا تو وہ بھی اس سے وابستہ ہو گئے۔ اور اس وجہ سے حکومت کے مقرب ہوئے۔ ان کے والد بھی سپاہی آدمی تھے۔ اور حکومت کی فوج میں ملازم۔ لیکن یہ عجیب بات ہے۔ کہ احمد بن حنبل بچپن ہی سے حکومت کی خدمت سے پرہیز کرتے رہے۔ سرکاری ملازمت سے ان کی نفرت کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک کافر حکومت کی ملازمت تو درکنار وہ ایک مسلمان بادشاہ کی ملازمت بھی اپنے لیے باعث ننگ سمجھتے تھے۔

ابتدا ہی سے آزادی پسند تھے

ان کے چچا بعض حکام کیلئے کچھ خدمت سر انجام دیا کرتے تھے۔ وہ بغداد کی خبریں مرتب کر کے بھیجتے کہ جب خلیفہ بغداد سے غیر حاضر ہو تو بغداد کے حالات کی اطلاع اس کو ملتی رہے۔ ایک حاکم کا بیان ہے۔

کہ ایک مرتبہ خبروں کے پہنچنے میں دیر ہوئی۔ میں نے احمد بن حنبل کے چچا سے پوچھا آج کی خبریں کیوں رہ گئیں۔ میں انتظار کرتا رہا۔ کہ موصول ہوں۔ تو انہیں خلیفہ کی خدمت میں پہنچاؤں۔ ان کے چچا نے جواب دیا۔ میں اپنے بھتیجے! احمد کے ہاتھ خبریں بھیج چکا ہوں۔ اتنے میں احمد بھی آگئے۔ اور وہ اس وقت نوعمر لڑکے تھے۔ ان کے چچا نے ان سے پوچھا۔ کیوں بیٹا میں نے تمہیں خبریں نہیں دی تھیں؟

احمد۔ دی تھیں چچا جان!

چچا۔ پھر تم نے خبریں کیوں نہ پہنچائیں۔؟

احمد۔ میں ان کو لیکر جا رہا تھا۔ پھر ایک نالے میں پھینک دیں۔

حاکم نے یہ سنا تو اِنَّا لِلّٰہِ پڑھ کر رہ گیا۔ اور کہنے لگا یہ لڑکا تو زاہد مرتاض ہے۔ اس کا کیا بنے گا۔

لیکن وہی لڑکا جو والی کے نزدیک بالکل ناکارہ تھا۔ اپنے اسی زہد واستغنار کی بدولت ایک زمانے کا امام بن کر نکلا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے تخت وتاج کی چاکری کے لیے نہیں بنایا تھا۔ بلکہ اس کو خدمت دین کے لیے پیدا کیا تھا۔

ننھیال کی طرف سے بھی ان کو اوصاف حسنہ ورثے میں ملے تھے۔ ان کے نانا قبیلہ شیبان کے سرداروں میں تھے۔ اور ان کا گھر مہمان خانہ بنا رہتا تھا۔ چنانچہ جہاں ددھیال کی طرف سے ان کو صبر و استقامت اور حمایت حق کے اوصاف ملے تھے۔ وہاں ننھیال کی طرف سے استغنار

اور سخاوت کے فضائل حسنہ انہوں نے پائے تھے۔

یتیمی اور پرورش

احمد بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کو نہیں دیکھا۔ غالباً ان کی ولادت کے تھوڑی ہی مدت کے بعد ان کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے دادا نے تھوڑی سی جائداد چھوڑی تھی۔ اسی پر ماں نے اس دُرِ یتیم کی پرورش کی۔

امام احمد کا ابتدائی زمانہ بغداد میں گذرا۔ یہ عروس البلاد اس وقت مرکز عالم تھا۔ عباسی خلافت اپنے انتہائی عروج پر تھی۔ ہارون الرشید کا دور حکومت تھا۔ اور دارالخلافہ علم و فن کا مرجع عام بنا ہوا تھا۔ قرار۔ محدث ارباب تصوف۔ علمائے لغت، حکمائے فلسفہ اور فقیہہ دنیا بھر سے کھچ کھچ کر یہاں آرہے تھے۔ اور علوم و فنون کے غلغلے سے درو دیوار گونج رہے تھے۔ انہی علمی چرچوں میں امام احمد نے آنکھ کھولی۔

ماں کی اولو العزمی

امام احمد کا خاندان کئی پشتوں سے سرکاری خدمات سر انجام دیتا آرہا تھا۔ ان کے دادا اور والد سرکاری مناصب پر فائز تھے۔ ان کے چچا بھی پرچہ نویسی کی خدمت سے منسلک تھے۔ اس خاندان کے ایک یتیم بچے کے متعلق اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی تھی کہ اس کو بھی کسی سرکاری ملازمت ہی سے منسلک کر دیا جائیگا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت دخل انداز ہوئی اور امام احمد کے گھر والوں نے شروع ہی سے ان کو ایک عالم دین بنانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس کے لیے سب سے پہلے انہیں قرآن مجید حفظ کرایا گیا۔ اس کے بعد علم لغت کی تعلیم دلائی گئی۔ اور جب وہ ذرا ہوشیار ہو گئے تو تحریر و کتابت میں دستگاہ پیدا کرنے کے لیے سرکاری دفاتر میں جانے لگے۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں چھوٹا سا لڑکا ہی تھا۔ جب کہ انشا پردازی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے منشیوں کے یہاں جاتا۔ اور جب ۱۴ برس کا ہوا تو سکریٹریٹ میں جانے لگا۔

شروع ہی سے پرہیزگار تھے

وہ بچہ ہی تھے کہ محلے کی عورتیں اور مردان سے خطوط لکھوانے لگے۔ خلیفہ ہارون الرشید باہر جاتا تو اس کی فوج کے سپاہی اپنے گھروں کو خط لکھتے۔ محلے میں احمد ہی تھے جو ان کو خط پڑھ کر سناتے۔ اور ان کے جواب لکھتے۔ عورتوں کا قاعدہ ہے کہ وہ خطوط میں ہر قسم کی باتیں لکھواتی ہیں مگر احمد خطوط میں کوئی ایسی بات نہ لکھتے جو تقویٰ کے خلاف ہوتی۔ بچپن ہی سے ان کے اندر احتیاط کی روح موجود تھی۔ اپنی نیک سیرتی کے لیے وہ لوگوں میں اس طرح معروف ہو چکے تھے کہ باپ اپنے بیٹوں کے سامنے ان کی مثال پیش کرتے۔ وہ کہتے ہم اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر اتنا کچھ صرف کر رہے ہیں۔ ان کے لیے استاد مقرر کر رکھے ہیں۔ تاکہ انہیں اخلاق و آداب سکھائیں۔ لیکن ان کی کچھ اصلاح نہیں ہوتی۔ احمد بن حنبل کو دیکھو کہ ایک یتیم لڑکا ہے۔ مگر کتنا نیک سیرت اور شریف ہے۔ امام احمد اپنے تقویٰ حسن سیرت اور ذہانت و ذکاوت کے اعتبار سے ابتدا ہی میں اتنے معروف

ہو گئے تھے۔ کہ عام لڑکوں سے صاف طور پر ممتاز نظر آتے تھے۔ اور اہل نظر ان کو دیکھ کر فیصلہ کر لیتے تھے۔ کہ ایک عظیم الشان انسان پرورش پا رہا ہے چنانچہ ہیثم بن جمیل نے ان کو دیکھ کر کہا تھا۔

"اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ کے لیے حجت ہوگا"۔

یہ رائے بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ جب ۷۷ برس کی عمر میں امام احمد نے انتقال کیا تو وہ اہل زمانہ کے لیے سرمایہ ہدایت و نور تھے۔ اپنے علم اخلاق۔ ورع۔ تقویٰ۔ صبر و استقامت۔ استغنار۔ اتباع سنت اور تمام اوصاف فاضلہ کے لحاظ سے وہ دنیا کے لیے دلیل و حجت تھے۔

تعلیم امام احمد جب ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئے۔ تو ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ علوم شریعت میں سے وہ کس شعبے کو اختیار کریں مسلک فقہا کو یا روایت حدیث کو۔ یہ دونوں شعبے اس زمانے میں بالکل ممیز تھے۔ جو لوگ علم فقہ کی طرف توجہ کرتے۔ وہ استنباط، مسائل اور افتار کے اصولوں کی تعلیم حاصل کرتے۔ اور جو لوگ علم روایت میں استعداد بہم پہنچاتے ان کا کام صرف احادیث کو حفظ کرنا ہوتا۔ محدثین کو فقہا عطاروں سے تشبیہ دیتے۔ جن کی دوکان میں تمام ادویہ ہوتی ہیں۔ مگر وہ ان کے استعمال سے واقف نہیں ہوتے۔ اور فقہا کو اطبار کے مشابہ قرار دیتے۔ جو ادویہ کو امراض انسانی کے ازالے کے لیے استعمال کرنے کا فن جانتے ہیں۔

امام احمد نے اپنی تعلیم کے لیے علم حدیث کو اختیار کیا۔ مگر انہوں نے

صرف روایت کے علم پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ تفقہ فی الدین کو پیش نظر رکھا۔
یعنی اپنی فقہ کی بنیاد روایت پر رکھی۔ اور آثار ہی کو اصول استنباط قرار دیا۔

امام احمد کے زمانے کا عراق

عراق فقہا اور محدثین کا آماجگاہ تھا — امام ابو یوسف اور امام محمد کی فقہ بھی رائج تھی۔ اور محدثین اور حفاظ حدیث بھی تھے۔ امام احمد نے رجال حدیث کی طرف رجوع کیا۔ لیکن اس سے قبل انہوں نے ایسے فقہا سے بھی کسب فیض کر لیا تھا۔ جو حدیث فقہ کے جامع تھے۔ چنانچہ ان کا اپنا بیان ہے۔ کہ وہ امام ابو یوسف کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ لیکن اہل الرائے کی فقہ نے ان کو اپیل نہ کیا۔ اور وہ کلیتہً حدیث کی طرف متوجہ ہو گئے۔

امام احمد کے زمانے میں محدثین پورے عالم اسلام میں پھیلے ہوئے تھے۔ بصرہ، کوفہ اور بغداد عراق کے تین بڑے علمی مرکز تھے۔ حجاز میں بھی محدثین کافی تعداد میں مسند درس سجا کر بیٹھتے تھے۔ ابھی اساتذہ کے بارے میں یہ تعصب پیدا نہیں ہوا تھا۔ کہ ایک شہر کے لوگ دوسرے شہر کے محدثین سے روایت اخذ کرنے میں بخل سے کام لیں۔ بلکہ طالب علم ادھر سے ادھر جاتے اور حدیث کا علم حاصل کرتے رہتے۔ چنانچہ امام احمد نے کسی مقام پر تحصیل علم میں اکتفا نہ کیا۔ بلکہ عراق، شام، حجاز ہر علاقے کے محدثین تک پہنچے

بغداد میں اکتساب فیض

امام احمد نے ۱۵ برس کی عمر سے اس راہ میں قدم رکھا تھا۔ قدرتی طور پر

سب سے پہلے وہ بغداد کے سرچشمہ ہائے علم سے سیراب ہوئے۔ ۱۷۹ھ سے ۱۸۶ھ تک انہوں نے بغداد کے شیوخ حدیث سے حدیث کا علم حاصل کیا۔ اور جو کچھ سنا اس کو لکھ لیا ۱۸۶ھ میں وہ بغداد سے بصرہ چلے گئے۔ وہاں سے وہ حجاز پہنچے۔ اور پھر ان کے علمی سفروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اور پھر انہوں نے اس کی مطلق پروا نہ کی۔ کہ سفر دور کا ہے یا قریب کا۔ ان کے پاس زادراہ ہے یا نہیں۔ سواری حاصل ہے یا نہیں امام احمد کا شوق حصول علم اس قدر زیادہ تھا کہ ان کی شفیق ماں کو بعض اوقات ان کو سمجھانا پڑتا تھا۔ کہ اپنی جان پر زیادہ سختی نہ کرو۔ لیکن یہی ماں ان کی ہمت بھی بڑھاتی تھی۔ ان کے راہوار شوق کو مہمیز بھی کرتی تھی۔ امام احمد کا بیان ہے کہ اگر کبھی صبح سویرے اٹھ کر میں مطالعہ حدیث کا ارادہ کرتا تو میری والدہ مجھے روک دیتیں اور فرماتیں اذان ہو لینے دو یا صبح ہو جانے دو۔

بغداد میں تحصیل علم کے بعد وہ بصرہ گئے۔ بصرہ سے حجاز۔ حجاز سے یمن اور وہاں سے کوفہ پہنچے۔ ان کا ارادہ تھا کہ وہ رے جا کر حضرت جریر بن عبداللہ سے علم حدیث حاصل کریں۔ لیکن رے بغداد سے اتنی دور تھا کہ سفر کے مصارف ان کے بس سے باہر تھے۔ اور جب اس کا انتظام ہوا تو امام جریرؒ کا انتقال ہو چکا تھا۔ انہوں نے بصرہ کے پانچ سفر کئے اور پانچ ہی مرتبہ حجاز گئے۔ جہاں امام شافعی سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کے علم و فضل سے اتنا متاثر ہوئے۔ کہ ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اور فقہ

شافعی اور اس کے اصولوں اور ناسخ منسوخ کے متعلق ان کے نظریات کا علم حاصل کیا۔ امام احمد امام شافعی کو وقت کا سب سے بڑا عالم تصور کرتے تھے۔ امام شافعی بھی حدیث کی تحقیق میں امام احمد پر اعتماد کرتے تھے۔

امام احمد نے پانچ حج کئے۔ ان میں تین پیدل کیے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ان میں سے ایک حج پر میں نے صرف ۳۰ درہم خرچ کئے ایک مرتبہ میں پیدل جارہا تھا کہ رستہ بھول گیا۔ اس پر میں پکار پکار کر کہنے لگا "اللہ کے بندو! مجھے رستہ بتاؤ۔ یہاں تک کہ میں نے رستہ پالیا۔

امام کی معاش اور معاشی نقطہ نگاہ

علم کے لیے امام احمد نے جو محنتیں برداشت کی تھیں۔ ان کا حال معلوم ہو چکا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح انہوں نے دور دراز کے سفر زادراہ کی کمی کے باعث پیدل کیے۔ کتابوں کا گٹھا ان کے سر پر ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ حمالی کا کام کر کے اجرت سے ضروریات زندگی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے دوست اور اساتذہ ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ پیکر استغنار اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ تکمیل علم کے بعد جب وہ مسند درس و تدریس کو زینت دیتے ہیں۔ تب بھی وہ اپنے دست و بازو کی محنت سے روزی کماتے ہیں۔ ان کا والد مختصر سی جائداد ان کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس کے کرائے پر

انحصار کرتے جو، اور نہ ہم ماہوار تھا۔ جب غریبی زیادہ ستاتی تو محنت و مزدوری کر لیتے۔ مگر دوستوں کے عطیے گوارا نہ کرتے۔

استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ان کے ہاتھ سے ان کی قینچی کنوئیں میں گر گئی۔ یہ کنواں ان کا اپنا تھا۔ ان کا ایک کرایہ دار آیا۔ اس نے قینچی نکال دی۔ امام احمد نے اس کی اجرت ایک درہم یا نصف درہم دینی چاہی اس نے کہا قینچی کی قیمت ہی ایک قیراط ہے" میں کوئی اجرت نہیں لونگا۔ کچھ روز بعد امام نے اس کو بلا کر کہا تمہارے ذمہ دوکان کا کتنا کرایہ واجب ہے اس نے کہا تین مہینے کا۔ اور ہر ماہ کا کرایہ تین درہم ہے۔ امام نے حساب لگا کر کہا جاؤ تمہارا کرایہ ادا ہو گیا۔ اب تمہارے ذمہ کچھ باقی نہیں۔

امام احمد اس امر کا انتہائی اہتمام رکھتے تھے کہ ان کی کمائی کامل طور پر حلال ہو۔ اس میں کسی قسم کا شبہ نہ ہو۔ چنانچہ ان کے والد کی جو جائداد انہیں ملی تھی۔ اور جس پر ان کی معاش کا انحصار تھا۔ اس کے بارے میں بھی وہ اعلان کرتے رہتے تھے۔ کہ اگر کوئی شخص آ کر ثابت کرے۔ کہ وہ اس کی ملکیت ہے تو وہ جائداد کو اس کے حوالے کر دیں گے۔

روزی کے معاملے میں وہ نہ کسی کا احسان گوارا کرتے۔ نہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرتے۔ بلکہ ایسے عالم میں بھی کہ وہ فاقوں سے ہوتے۔ اگر کوئی شخص ان پر احسان کرنا چاہتا۔ تو قبول نہ کرتے۔ اور اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کی تکلیف برداشت کر لیتے۔ ان کے تین ذرائع معاش تھے۔

فصل کی کٹائی کے وقت وہ کھیتوں میں نکل جاتے۔ اور فصل اُٹھا لینے کے بعد جو غلہ زمیندار یونہی چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ اسے اکٹھا کر لیتے اور اس کے لیے بھی وہ کھیت کے مالک سے اجازت لے لیتے۔ پھر اس میں قدم رکھتے۔ وہ محنت مزدوری میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے ان کے نزدیک ہر کام شریفانہ تھا۔ جب کہ عزت نفس پر حرف نہ آئے اور ان کا ہاتھ کسی دوسرے کے ہاتھ سے نیچا نہ ہو۔

محنت مزدوری مثلاً وہ حمالی بھی کر لیتے تھے۔ سفروں کے درمیان جب کوئی اور صورت حصول معاش کی نہ ملتی تو مسافروں کا سامان اٹھا لیتے اور اس کی اجرت سے ضروریات پوری کرتے۔

کبھی کبھی اجرت پر کتابت بھی کرتے علی بن جہم کا بیان ہے۔ ان کا ایک پڑوسی تھا اس نے ایک روز ایک تحریر دکھائی اور پوچھا تمہیں معلوم ہے یہ کس کا خط ہے۔؟ میں نے کہا یہ تو احمد بن حنبل کی تحریر معلوم ہوتی ہے تمہارے ہاتھ یہ کیوں کر آئی۔ اس نے جواب دیا۔

"ہم مکہ معظمہ میں حضرت سفیان بن عیینہ کے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ احمد کئی روز تک غائب رہے۔ ہم ان کو دیکھنے نکلے۔ دیکھا کہ ان کا دروازہ بند ہے"۔ میں نے کہا۔

"تم دروازہ بند کر کے کیوں بیٹھ گئے"۔

جواب آیا "میرے کپڑے چوری ہو گئے ہیں اس لیے اندر بیٹھا ہوں" میں نے کہا میرے پاس کچھ دینار ہیں چاہو تو ہدیۃً لے لو۔ یا قرض کے طور

پر"۔ کہا "نہیں"۔ میں نے کہا تو اجرت پہ مجھے کچھ لکھ دو"۔ کہا "ہاں یہ ہو سکتا ہے"۔

میں نے ایک دینار پیش کیا۔ کہا "جا کر اس کا کپڑا لے آؤ۔ نصف کا تہمد اور آدھے کی چادر بنا دو۔ اور کاغذ بھی لیتے آؤ"۔ میں حسب ہدایت کاغذ لے آیا۔ اور احمد بن حنبل نے مجھے یہ تحریر لکھ دی۔ اس کے علاوہ کپڑا بھی بُن لیتے تھے۔ اور فروخت کر کے ضرورت پوری کر لیتے تھے

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں۔ کہ جب ہم شیخ عبدالرزاق کے یہاں یمن میں تھے تو جس مکان میں ہم رہتے تھے اس کی بالائی منزل میں میں، تھا۔ اور نچلی میں احمد تھے۔ میری عادت تھی کہ جب کسی جگہ ٹھہرتا تو ایک لونڈی خدمت کے لیے خرید لیتا۔ ایک روز میری کنیز نے بتایا کہ احمد کے کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا ہے۔ میں نے جا کر کہا "حضرت یہ رقم حاضر ہے۔ خواہ ہدیہ کے طور پر اور خواہ بطور قرض"۔ جواب دیا "شکریہ مجھے ضرورت نہیں"۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کپڑا بنتے اور اسے بیچ کر اپنی ضروریات مہیا کرتے ہیں۔

ان کا تیسرا ذریعہ قرض تھا۔ لیکن یہ اس صورت میں کہ ان کو یقین ہوتا وہ جلد ہی ادا کر دیں گے۔ اور قرض کی حیثیت احسان کی نہیں ہو گی قرض صرف حضر میں لیتے۔ سفر میں نہ لیتے۔ کیوں کہ اپنے گھر پہ آدمی ہو تو قرض کے جلد ادا ہونے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔ بعض اوقات وہ تو اس نیت سے قرض لیتے کہ ادا کریں گے۔ اور دینے والا اس ارادے

سے دیتا کہ واپس نہیں لونگا۔ اب وہ ادا کرنے پر اصرار کرتے اور دینے والا وصول کرنے سے انکار کرتا۔ لیکن امام احمد اپنی بات پوری کر کے رہتے۔ پھر وہ قرض بھی اس سے لیتے جس کے متعلق اطمینان ہوتا کہ اسکی روزی حلال کی ہے۔

ایک مرتبہ ایک نیک اور پرہیزگار دوست سے دو یا تین سو درہم قرض لیے۔ جب رقم واپس دینے لگے۔ تو دوست نے کہا ابو عبداللہ میں نے واپس لینے کی نیت سے قرض نہیں دیا تھا۔ امام احمد نے برجستہ جواب دیا اور میں نے بھی اس ارادے سے قرض لیا تھا کہ ادا کرونگا۔

اکل حلال کا انتظام

اگر کسی رقم کے متعلق ان کو ذرا سا شبہ بھی ہو جاتا کہ وہ حلال نہیں ہے تو اسے رد کر دیتے اور قبول نہ کرتے۔ اس معاملے میں وہ عزیمت کو غالب رکھتے۔ معاشرہ بگڑ چکا تھا۔ اور لوگوں کی روزیاں مشتبہ ہو گئی تھیں۔ امام احمد اپنے تقوی اور زہد کی وجہ سے ہر قسم کے شبہے سے بچتے تھے۔ وہ اپنے دین کے بارے میں بخیل اور مال کے معاملے میں فیاض تھے۔ یعنی انتہائی عسرت و افلاس کے باوجود بے حد سخی تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ اکل حلال ہی حقیقت احسان ہے۔ اس سے دل اللہ کی طرف مائل ہوتا اور انسان کو راہ تقوی پر قائم رہنے کی توفیق ملتی ہے۔

ایک نکتہ لطیف

ابو حفص عمر بن صالح طرسوسی کہتے ہیں۔ میں ابو عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا

"اطمینانِ قلب کس طرح حاصل ہوتا ہے"۔

احمد بن حنبل نے اپنے شاگردوں کی طرف دیکھا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہے پھر سر اٹھایا اور فرمایا۔

"اے میرے بیٹے حلال روزی سے"۔

میں ان کے پاس سے اُٹھ کر ابو نصر بن حارث کے پاس گیا اور کہا "اے ابو نصر!۔ "اطمینانِ قلب کے حصول کی کیا ترکیب ہے"۔

ابو نصر نے فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوتے ہیں۔ میں نے کہا "میں ابو عبداللہ (احمد بن حنبل) کے یہاں سے بھی اسی کے متعلق پوچھ کر آرہا ہوں"۔ ابو نصر نے کہا ہاں ہاں! مجھے بتاؤ انہوں نے کیا جواب دیا۔ میں نے بتایا کہ "اکل حلال" ابو نصر! بولے بالکل ٹھیک کہا! پھر میں عبدالوہاب بن ابی الحسن کی خدمت میں گیا اور یہی سوال ان سے کیا انہوں نے بھی جواب میں وہی آیت پڑھی جو ابو نصر نے پڑھی تھی میں نے ان کو بھی بتایا کہ میں احمد بن حنبل سے بھی یہی سوال کر کے آرہا ہوں۔ یہ سن کر عبدالوہاب کے دونوں رخسار چمک اُٹھے اور بیتابی سے بولے "تو انہوں نے کیا جواب دیا" میں نے بتایا کہ اُکل حلال، فرمایا۔ "ابو عبداللہ نے کانٹے کی بات بتائی، حق وہی ہے جو انہوں نے کہا"!!

امام احمد حلال ہی کماتے، حلال ہی کھاتے اور ہر مشتبہ چیز سے دست کش رہتے۔ اور اس معاملے میں وہ بے حد قانع۔ مطمئن اور غیور تھے۔ اپنا ہاتھ ہمیشہ اوپر رکھتے۔

وظائف حکومت کے متعلق امام کا مسلک

خلفا کے پاس جو مال ہے وہ مسلمانوں کا مال ہے۔ اور ان کی زکوٰۃ سے جمع کیا گیا ہے۔ اور خلفا کا فرض ہے کہ وہ اس مال کو امت کے مصالح میں اور امت کی ضروریات میں صرف کریں۔ علماء و محدثین کی امداد کرنا بھی بلاشبہ اس فرض میں داخل ہے۔ اگر وہ اس مال کو قبول کریں تو یہ خلفا کے مال میں سے قبول کرنا نہ ہوگا لیکن امام احمد اپنی ذات کی حد تک اس رخصت کو بھی جائز نہیں رکھتے تھے۔ وہ حکومت کے ساتھ کسی قسم کا تعلق اور واسطہ قائم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اور اس سے کسی طرح کی منفعت کو گوارا نہیں کرتے تھے۔ امام شافعیؒ امام احمدؒ کے استاد تھے۔ شاگرد کے دل میں اپنے استاد کی بے حد قدر و منزلت تھی۔ امام احمد ان کو محض ایک استاد ہی نہیں بلکہ ان کو مجدد عصر بھی سمجھتے تھے۔ جب امام شافعی دوسری مرتبہ بغداد آئے اور اپنا مذہب نشر کرنے لگے تو امام احمد بالالتزام ان کی مجلس میں شریک رہتے۔ اور صرف اس وقت غیر حاضر ہوتے جب کہ طلب حدیث کے لیے سفر کرنا پڑتا۔ امام شافعی کو معلوم ہوا کہ امام احمد جب شیخ عبدالرزاق ہمام سے حدیث حاصل کرنے جاتے ہیں تو ان کو سفر و حضر میں زادِ راہ کی کمی اور مالی تنگی کے باعث سخت مشقت اٹھانی پڑتی ہے۔ انہوں نے سوچا کہ احمد یمن کے قاضی بن جائیں۔ کیوں کہ یہ عہدہ ان کو آسانی سے مل سکتا تھا۔ اس طرح وہ شیخ عبدالرزاق سے بآسانی حدیث بھی حاصل کرلیں گے۔ چناں چہ

انہوں نے یہ تجویز امام احمد کے سامنے پیش کی۔ مگر انہوں نے اسے ناپسند کیا۔ امام شافعی نے موقعہ پاکر دوبارہ کہا۔ اس پر امام احمد بولے۔ اے ابو عبداللہ اگر میں نے آپ سے یہ بات دوبارہ سُنی تو پھر آپ مجھے کبھی اپنے پاس نہ پائیں گے"۔ یعنی اس معاملے میں امام احمد اس قدر سخت تھے کہ انہیں اپنے استاد کی دائمی مفارقت گوارا تھی مگر اس مشورے کا سننا تک گوارا نہ تھا۔

قبول عطیات سے انکار کی وجہ

امام احمد خلفار کے عطیات اس وجہ سے قبول نہیں کرتے تھے کہ وہ ان کو مشتبہ مال تصور کرتے تھے۔ اس مسئلہ میں اُئمہ اسلام کے تین مسالک رہے ہیں۔

(۱) بادشاہ اور حکومت کے مال سے کلی اجتناب۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام سفیان ثوریؒ کا یہی مسلک تھا۔ امام ابوحنیفہ کو منصور تحفے تحائف اور ہدیے دیتا مگر وہ اسے قبول نہ کرتے اور فرماتے کہ اس کو خلیفہ خود ہی فقیروں کو دے ڈالے۔ منصور اس انکار پر برہم ہوتا اور اس کے درباری امام صاحب کو مشورہ دیتے کہ آپ خلیفہ سے مال قبول کرلیں۔ اور صدقہ کردیں۔ لیکن وہ سرکاری مال کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنی ملکیت میں لینا گوارا نہ کرتے۔ خواہ اس کے کچھ ہی نتائج ہوں۔

(۲) خلفار سے رقم وصول کرلی جائے اور اہل علم کی ضروریات میں صرف کردی جائے۔ اس لیے کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے۔ اور اہل علم اس کے

سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ امام حسن بصری اور امام مالک اس مسلک کے عامل تھے۔ امام مالک بادشاہوں سے ہدیے لے لیتے اور ان کو ضرورت مند اہل علم پر صرف کر دیتے۔ اور فرماتے کہ یہ لوگ مملکت دین کے "سپاہی" ہیں۔ دین کی تعلیم دینے اور امر معروف اور نہی منکر سے اسلام کی محافظت کرتے ہیں۔ امام مالک ارباب حکومت سے مقاطعہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اصلاح و تبلیغ کے لیے ان سے ملتے جلتے رہتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان سے میل جول ہوگا تو عطیات ملیں گے۔ اور ان کو مسترد کرنا مشکل ہوگا۔

(۳) تیسرا مسلک ان دونوں مسلکوں کے بین بین تھا۔ یعنی خلفاء سے عطیات کی رقم لے لینا اور پھر صدقہ کر دینا۔ اس پر امام شافعی کاربند تھے۔ وہ ہارون الرشید سے ہدیے قبول کر لیتے مگر قصر خلافت سے باہر نکل کر گھر پہنچتے پہنچتے حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتے۔ امام شافعی نے مصر میں بنی مطلب کے حصہ غنیمت کو بھی قبول کر لیا تھا۔ اس لیے کہ بنی ہاشم نے ہر مرحلے پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی۔ صلح اور جنگ میں بھی! اور کفر و اسلام میں بھی۔

امام احمد نے امام ابو حنیفہ کے مسلک کو اختیار کیا تھا۔ اس معاملے میں ان کا مجاہدہ زیادہ سخت تھا۔ کیوں کہ امام ابو حنیفہ کی طرح وہ امیر آدمی نہ تھے۔ بلکہ نہایت تنگی ترشی میں بسر اوقات کر رہے تھے۔ وہ خلفا کے عطیات رد کر دیتے اور اپنی ضرورتیں مزدوری کر کے حمالی کر کے کتابت کر کے اور

کھیتوں میں سے اناج چن کر اور قرض دام لے کر گذارہ کرتے۔

ایک مرتبہ مامون نے ایک عالم حدیث کو کچھ مال دیا۔ کہ وہ علم حدیث کے ان طالب علموں پر صرف کر دیں۔ جن کو وہ محتاج پائیں۔ چنانچہ سب نے اس میں سے قبول کر لیا۔ صرف ایک احمد بن حنبل تھے۔ جنہوں نے یہ ننگ گوارا نہ کیا۔

خلیفہ متوکل اور امام احمد

مامون معتصم اور واثق سے تو امام احمد کی جنگ رہی۔ اور انکے ہاتھوں انہیں شدید ترین اذیتیں پہنچیں۔ مگر خلیفہ متوکل کے زمانے میں جب دوسرا دور شروع ہوا اور انعام و اکرام کی بارش کا زمانہ آیا۔ تو امام احمد کی آزمائش اور زیادہ سخت ہو گئی۔ مگر وہ اس میں بھی کامیاب نکلے متوکل نے ان کو بے حساب مال دینا چاہا۔ اور اس کے قبول کرنے پر حد سے زیادہ اصرار کیا۔ اور خلیفہ کے درباریوں نے بھی قبول کرنے پر بے حد زور دیا۔ لیکن امام قطعاً رضامند نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ انہوں نے مال لے کر اسے صدقہ کر دینے کی ہامی بھی نہ بھری۔ خود خلیفہ نے ان سے کہا کہ ہدیہ مجھ سے قبول کر لیجئے اور پھر اسے صدقہ کر دیجئے۔ لیکن امام احمد نے ایک لمحے کے لیے بھی اس کو اپنی ملکیت میں لینا قبول نہ کیا۔ وہ فرماتے تھے یہ مال فقرا اور مساکین کے لیے ہے اور ملک کی حفاظت کرنے والی فوجوں کے لیئے وہ خود کو عزیمت و افلاس کے باوجود اس مال کا مستحق نہیں سمجھتے تھے۔

غرض مندوں نے امام احمد کو خلیفہ کی نظروں سے گرانے کے لیے امام احمد کے انکار کو بھی ایک حربہ بنانے کی کوشش کی۔ چنانچہ ایک مرتبہ ان لوگوں نے چغلی کھائی کہ امام احمد نے ایک علوی کو جس نے خلافت کے خلاف خروج کیا تھا اپنے گھر میں چھپا رکھا ہے۔ اس پر ان کی خانہ تلاشی ہوئی۔ مال قبول کرنے سے انکار کو یہ مفسد اس بات پر محمول کر کے متوکل کے سامنے پیش کرتے تھے۔ کہ وہ حکومت کے مخالف ہیں۔ اور علویوں کے حامی۔

امام احمد نے بالآخر تنگ آکر فتنہ پردازوں کا منہ بند کرنے کی خاطر کچھ عرصے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ متوکل کے ہدیے قبول کر لیتے اور ایسے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے جو کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے تھے۔

ایک موقعہ پر متوکل کے وزیر نے امام کو لکھا کہ امیرالمومنین آپ کو کچھ عطیہ دینا چاہتے ہیں۔ اور آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان کے پاس تشریف لائیں۔ خدا کے لیے اس عطیے کو مسترد نہ کیجئے گا ورنہ ان لوگوں کی بن آئے گی جو آپ سے دشمنی رکھتے ہیں۔ امام نے چغل خوروں کی شرارت سے بچنے کے لیے عطیہ قبول کر لیا۔ مگر خود اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ بلکہ اپنے لڑکے صالح سے کہا اسے لے چلو اور اگلے روز پوری رقم مہاجرین اور انصار کے گھروں میں تقسیم کر دی۔ امام کہتے تھے اس مال کے یہ لوگ زیادہ مستحق تھے مگر ان کو اس سے محروم کر دیا گیا ہے۔

فتنہ پردازوں کی شرارتیں

فتنہ پرداز لوگ خلیفہ کے کان بھرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ۔ وہ کہتے احمد نہ آپ کے دسترخوان سے کھاتے ہیں نہ آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں اور نہ آپ کے یہاں سے پانی کا ایک گھونٹ پیتے ہیں۔ کیا وہ آپ کے اخلاص مند ہو سکتے ہیں"۔ مگر متوکل کو ان کے تقویٰ اور نیکی کا اتنا یقین تھا کہ وہ ان کو ڈانٹ دیتا۔ اور کہتا اگر معتصم بھی ان کے خلاف کچھ کہتا تو میں باور نہ کرتا۔ وہ آخر کار ان کی طرف سے اتنا مطمئن ہو گیا تھا۔ کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ چاہے عطیہ قبول کریں چاہے نہ کریں۔ چنانچہ وہ بالعموم انکار ہی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خلیفہ نے ان کی خدمت میں ایک ہزار دینار بھیجا کہ اہل حاجت میں تقسیم کر دیں۔ متوکل کا مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک تو ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کر دے دوسرے صحیح قسم کے اہل حاجت تک مال پہنچا دے۔ مگر امام احمد نے یہ مال قبول نہ کیا۔ اور کہلا بھیجا "کہ امیر المومنین نے مجھے ان باتوں سے معاف کر رکھا ہے جو مجھے ناپسند ہیں۔ اور یہ وہ بات ہے جو مجھے ناپسند ہے۔

اپنے عزیزوں کو بھی روکتے تھے

امام احمد خود ہی سرکاری عطیات سے پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اپنے بیٹوں اور عزیزوں کو بھی روکتے تھے۔ لیکن بہر حال وہ لوگ اس مقام پر فائز نہیں تھے۔ اور خلیفہ کی دی ہوئی رقمیں قبول کر لیتے تھے۔ امام احمد ان سے کہتے۔

"تم یہ مال کس طرح قبول کرتے ہو۔ جب کہ ملک کی سرحدیں خالی اور غیر محفوظ پڑی ہیں، اور مال ان کے حق داروں کو نہیں پہنچتا۔"

جب وہ باز نہ آئے تو انہوں نے ان کے گھر سے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ ان سے میل جول ترک کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ ان کے تنور کی پکی ہوئی روٹی بھی نہیں کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کے لڑکے کے گھر کے تنور میں ان کے لیے روٹی پکائی گئی۔ ان کو معلوم ہوا تو ہاتھ کھینچ لیا۔ اور کہا وہ بادشاہ کے ہدیے قبول کرتا ہے۔ بادشاہ یہ سنتا تو نہ خفا ہوتا نہ انتقام لیتا اس کو معلوم تھا کہ اس طرز عمل کا باعث صرف ایمان و اخلاص ہے۔ وہ کہتا "احمد تو اپنی اولاد کے ساتھ بھی ہمیں احسان نہیں کرنے دیتے"۔ اور وہ خفیہ طور پر ان کی اولاد اور ان کے اقربا کی خدمت کرتا۔

لیکن یہ بات نہیں تھی کہ ان کے نزدیک خلفاء کا مال حرام تھا۔ بلکہ وہ اس کو اپنے لیے مشتبہ اور دوسروں کے لیے حلال سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ خلیفہ کے عطیات دوسرے مسلمانوں کو دے دیتے۔ اور ظاہر ہے جو شے حرام ہو وہ اپنے مسلمان بھائی کو بھی نہیں دینی چاہیئے۔ ایک مرتبہ امام بیمار تھے۔ ان کا بیٹا عیادت کو حاضر ہوا۔ اور پوچھا کہ خلیفہ کے عطیات میں سے کچھ رقم میرے پاس بچ رہی ہے۔ کیا میں اس سے حج کر لوں؟ امام احمد نے جواب دیا۔ ہاں۔ ان کے لڑکے نے پوچھا۔ جب یہ رقم آپکے پاس موجود تھی تو آپ نے اسے استعمال کیوں نہ کیا۔ امام نے فرمایا بیٹے میرے نزدیک یہ حرام تو نہیں۔ مگر میں پھر بھی اس سے بچتا ہوں۔ امام

موصوف کے نزدیک ہرچند یہ عطیات فی نفسہٖ حرام نہیں تھے۔ تاہم وہ ازبا عزیمت کے طریق پر عمل کرتے تھے۔ اور ان کا مسلک اس ارشاد نبوی پر مبنی تھا۔ کہ جو بات مشکوک ہو۔ اس کو چھوڑ کر اس بات کو اختیار کرو جو مشتبہ نہ ہو۔

حج اور حصول علم میں مشقت پسندی

امام احمد نے پانچ حج کیے۔ جن میں تین حج پیدل کیے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے۔ کہ امام حصول ثواب کے لیے سواری کی بجائے دیار محبوب کو پاپیادہ جانا پسند کرتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ کہ ان کے پاس سواری کے اخراجات نہیں ہوتے تھے اور تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ امام کا مقصد حج سے محض حج کرنا نہیں تھا۔ بلکہ وہ بیت اللہ کے قریب بودوباش اختیار کرنا اور علم حدیث حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ غرض اسی طرح پوری ہو سکتی تھی کہ ان کے ہمراہ سازوسامان اور سواری نہ ہو۔ چنانچہ انہوں نے ان سفروں سے پورا علمی فائدہ بھی اُٹھایا۔ ان علمی سفروں نے ان کو سخت مشقت پسند بنا دیا تھا۔ ایک مرتبہ کوفہ گئے تو ہرچند کوفہ بغداد سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے شدید تکلیف برداشت کی۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ میں رات کو ایک اینٹ سرہانے رکھ کر سویا کرتا تھا۔ ان کے چند دوست امام جریر بن عبدالحمید کے پاس گئے۔ مگر امام احمد کے پاس زادراہ زیادہ نہیں تھی اس لیے نہ جا سکے۔ وہ کہتے تھے اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے۔ تو میں وہاں ضرور جاتا۔ طلب حدیث میں وہ اس لیے بھی مشقت برداشت کرتے تھے کہ جو نعمت آسانی سے حاصل

ہو جائے۔ اس کی قدر نہیں ہوتی۔ طلب حدیث میں وہ ہجرت کی بھی نیت کرتے تھے۔

حدیث کے لیے یمن کا سفر

سنہ ۱۹۹ھ میں وہ حج کے لیے گئے دوران حج میں انہوں نے اپنے ایک رفیق یحییٰ بن معین سے ذکر کیا کہ میں شیخ عبدالرزاق بن ہمام کی خدمت میں طلب حدیث کے لیے حاضر ہونا چاہتا ہوں جو صنعاء میں ہیں۔ حسن اتفاق وہ طواف قدوم کر رہے تھے کہ کیا دیکھتے ہیں۔ شیخ عبدالرزاق بھی طواف کر رہے ہیں۔ یحییٰ بن معین ان کو پہچانتے تھے۔ انہوں نے سلام کیا اور تعارف کراتے ہوئے کہا۔

یہ احمد بن حنبل ہیں۔

عبدالرزاق نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ "میں ان کا شہرہ سن چکا ہوں"۔ ابن معین نے کہا کہ ہم کل انشاء اللہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث سنیں گے۔ اور لکھیں گے۔

شیخ عبدالرزاق نے کہا بصد شوق تشریف لائیے۔ جب وہ چلے گئے تو امام احمد نے کہا یہ "تم نے کیا کیا کہ شیخ عبدالرزاق سے کل کا وعدہ کر لیا"۔

ابن معین نے کہا "میاں کل ہم ان سے حدیث سنیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر کرو کہ وہ یہیں مل گئے۔ اور تمہارا ایک ماہ کا سفر جانے کا اور ایک ماہ کا سفر آنے کا بچ گیا۔ اور سفر کے اخراجات سے بھی

نجات ملی"۔

"امام نے جواب دیا" میں تمہارے مشورے پر عمل کر کے اپنی نیت کا ثواب ضائع نہیں کروں گا۔ میں تو صنعا جاؤں گا۔ اور وہیں ان سے حدیث سنوں گا" چنانچہ حج کے بعد وہاں گئے۔ اور شیخ سے حدیث حاصل کی۔

اللہ اکبر اس شوق علم کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے۔ مکہ ہی میں موقع تھا۔ کہ سفر کی صعوبتیں اٹھائے بغیر حدیث حاصل کر لیں۔ مگر اس سہولت کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ طلب علم میں مہاجرت کو ترجیح دی۔

جب یمن گئے تو اثنائے سفر میں زادراہ کم ہو گئی۔ اس پر بعض مزدوروں سے اجرت پر سامان اٹھانے کا معاملہ کیا۔ اور اس طرح صنعا پہنچے۔ ان کے ساتھیوں نے ان کی مالی امداد کرنی چاہی۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

جب صنعا پہنچے تو شیخ عبدالرزاق نے ان کی حالت دیکھ کر کہا۔ "ابو عبداللہ ہمارے شہر میں محنت مزدوری کا کوئی سلسلہ نہیں۔ اس لیے یہ رقم لو اور اپنے کام میں لاؤ"۔ یہ کہہ کر کچھ دینار ان کو دینا چاہے۔ مگر احمد نے کہا آپ میری فکر نہ کیجئے۔ میں اپنا انتظام خود کر لوں گا۔ چنانچہ دو برس اسی طرح محنت مشقت سے بسر کیے۔

زندگی بھر طالب علم رہے

امام احمد عمر اور علم میں پختگی کے باوجود طلب علم کے لیے سفر اختیار کرنے پر آمادہ رہتے تھے۔ انہوں نے امام شافعی سے آخری ملاقات میں کہا کہ میں مصر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ لیکن جب وہ نہ پہنچے تو

امام شافعی نے افسوس کے طور پر کہا کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس آنے کا وعدہ کیا تھا مگر نہیں آئے۔ ابن ابو حاتم جو ان کے پاس بیٹھے تھے بولے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی تنگ دستی مانع ہو گئی ہو گی۔

امام احمد عالم اسلام کے مختلف حصوں میں طلب حدیث کے لیے گئے۔ اور دور دور پہنچے۔ ان سفروں میں وہ اپنی کتابوں کا گٹھا اپنی کمر پر لادے پھرتے تھے۔

ان کے ایک دوست نے ایک سفر کے دوران میں ان کی روایت حدیث کی۔ احتیاط اور ان کے یاد کرنے اور لکھنے کے انہماک کو دیکھ کر کہا۔ تم کبھی کوفہ جاتے ہو کبھی بصرہ۔ آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہیگا۔ مگر ایسے معترضین کے لیے ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ کہ "جب تک زندہ ہوں"۔۔۔۔۔ حد یہ ہے کہ جب ان کو امامت کا مقام حاصل ہو گیا۔ اور عالم اسلام ان سے مسائل کے بارے میں رجوع کرنے لگا اس وقت بھی ان کی حالت ایک طالب علم کی سی تھی۔ ان کے ایک معاصر نے ان کو دیکھا کہ روات لیے لکھ رہے ہیں۔ اور احادیث سن رہے ہیں۔ اس نے کہا۔

"اے ابو عبداللہ۔ مسلمانوں کے امام ہو کر بھی آپ یہ کام کر رہے ہیں"۔

امام نے جواب دیا۔

"قلم اور دوات۔ جب تک حیات"۔

امام رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے "میں علم حاصل کرتا رہوں گا۔ یہاں تک

کہ قبر میں پہنچ جاؤں گا۔"

امام موصوف اس چیز کا عملی نمونہ تھے۔ کہ انسان اسی وقت تک عالم رہتا ہے۔ جب تک وہ علم حاصل کرتا رہتا ہے۔ جب وہ یہ سمجھنے لگے۔ کہ عالم ہو گیا تو سمجھ لو کہ بے علم ہو گیا۔

روایت میں انتہائی محتاط

ایک زمانہ تھا کہ لوگ لکھنے سے زیادہ حافظے پر اعتماد کرتے تھے۔ مگر امام احمد صرف حفظ پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ احادیث نبوی اور آثار صحابہ میں سے جو کچھ وہ سنتے اس کو یاد بھی کر لیتے۔ اور لکھ بھی لیتے۔ ان کا عہد تدوین علوم کا عہد تھا۔ فقہ لغت اور علوم حدیث کی تدوین ہو رہی تھی۔ لہٰذا وہ بھی تمام احادیث کو اور ان کی اسناد کو قلمبند کر لیتے تھے۔ اس معاملے میں ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب کوئی حدیث بیان کرتے تو کتاب میں دیکھ کر روایت کرتے وہ اس بات سے سخت ڈرتے تھے کہ حافظہ غلطی کر جائے۔ اور وہ ارشاد رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بدلنے کے گناہ میں مبتلا ہو جائیں۔

ایک مرتبہ مرو کے ایک شخص نے ایک حدیث کے بارے میں سوال کیا امام نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا۔ کتاب الفوائد لاؤ۔ اور اس میں سے حدیث نکال کر دکھاؤ۔ مگر ان کے بیٹے کو کتاب نہ ملی۔ اس پر وہ خود اٹھے اور کتاب لائے اور اس میں سے خود حدیث تلاش کر کے نکالی۔

ایک اور مرتبہ ایک آدمی آیا۔ اور اس نے کہا جو کچھ اللہ نے آپ کو سکھایا ہے۔ مجھے بھی سکھائیے۔ یہ سن کر اٹھے گھر میں گئے۔ حدیث کی کتابیں نکال کر لائے

اور اس کو لکھوانے لگے۔ جب لکھوا چکے تو فرمایا۔

"جو کچھ تم نے لکھا ہے۔ اسے پڑھ کر سنا دو۔"

فارسی بھی جانتے تھے

امام احمد نے اپنے عہد کے ضروری علوم بھی حاصل کئے تھے۔ مگر ان کی اصل توجہ حدیث و آثار اور فتاوائے صحابہ پر مرکوز رہی۔ فارسی زبان بھی جانتے اور بولتے تھے۔ اگر ان کا مخاطب عربی زبان میں بات نہ سمجھ سکتا اور فارسی جانتا ہوتا تو امام فارسی زبان میں اس سے خطاب کرتے۔

ایک مرتبہ خراسان سے ان کا خالہ زاد بھائی آیا اور ان کے پاس ٹھہرا۔ جب کھانے کا وقت آیا۔ تو امام احمد اس سے خراسان کے حالات دریافت کرنے لگے۔ اور اس سے گفتگو فارسی میں کی۔

امام احمد امام مالکؒ تک نہ پہنچ سکے۔ ان کے طلب حدیث کا ابتدائی زمانہ تھا۔ کہ امام مالک کا انتقال ہوگیا۔ اسی طرح وہ امام عبد اللہ بن مبارک سے بھی فیض حاصل نہ کر سکے۔ جب امام عبد اللہ بن مبارک بغداد آئے تھے۔ تو امام احمد ابھی طلب حدیث کی ابتدائی منزل میں تھے۔ اور ان سے نہ مل سکے۔ پھر وہ طرطوس چلے گئے۔ اور بغداد واپس نہ آ سکے۔

مسند درس و افتار پر جلوہ گر ہوتے ہیں

امام احمد جب تک چالیس سال کی عمر کو نہ پہنچ گئے۔ درس حدیث اور افتار سے گریز کرتے رہے۔ ۲۰۳ھ میں ان کا ایک معاصر ان سے تلمذ حدیث حاصل کرنے آیا۔ امام احمد نے صاف انکار کر دیا۔ یہاں سے

مایوس ہو کر وہ شیخ عبدالرزاق کے پاس یمن چلا گیا۔ ایک سال بعد وہ ۲۰۴ھ میں واپس آیا۔ تو دیکھا امام احمد درس حدیث میں مشغول ہیں۔ اور لوگوں کا تانتا بندھا ہوا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام احمد اپنے اساتذہ کی زندگی میں مسند درس پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ مگر ان کے دینی ذوق کو دیکھتے ہوئے زیادہ صحیح توجیہ یہ ہے کہ ان پر اتباع رسول کا غلبہ تھا۔ وہ ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کو پسند کرتے تھے۔ چنانچہ اگر کبھی حجام سے پچھنے لگواتے تو اس کو ایک دینار اجرت میں دیتے۔ اس لیے کہ ایک روایت میں آیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے تو ابو طیبہ کو ایک دینار مرحمت فرمایا۔ اسی طرح ایک دوسرا واقعہ ہے۔ کہ امام احمد کو لونڈی سے مباشرت کرنا طبعاً مرغوب نہیں تھا۔ لیکن محض اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لونڈی سے تمتع فرمایا اتباع کی خاطر امام احمد نے اپنی بیوی سے اس غرض کے لیے اجازت لی اور اس نیک بخت نے بھی ان کو اتباع رسول میں امداد دینے کے لیے اجازت دی۔ امام احمد کے اس ذوق اتباع نبوی کو دیکھتے ہوئے یہ امر زیادہ قرین قیاس ہے۔ کہ درس و افتاء کا کام شروع کرنے کے لیے بھی انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے اس پہلو کو اختیار کیا ہو گا۔ کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت چالیس سال کی عمر میں حاصل ہوا۔ اس عمر کو امام احمد نے بھی درس و افتا کا باقاعدہ سلسلہ شروع کرنے کے لیے پسند کیا۔ اس سے قبل بھی وہ بوقت ضرورت حدیث کی روایت کرتے اور فتویٰ دیتے تھے۔ لیکن ۲۰۴ھ میں انہوں نے یہ کام باقاعدہ طور پر شروع کر دیا۔ اور طالب علم جوق در جوق ان کے درس میں شامل

ہونے لگے۔ مسند درس پر بیٹھنے کے زمانے تک ان کے علم و تقویٰ کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اور طالب علم اور فتویٰ طلب کرنے والے ان کے پاس عالم اسلام کے مختلف حصوں سے آنے لگے تھے۔ اور اس وجہ سے وہ جامع مسجد میں درس دینے پر مجبور ہوئے تھے۔ چنانچہ اندازہ ہے کہ ان کے درس میں پانچ پانچ ہزار سامعین کا ہجوم ہوتا تھا۔ اور جو طالب علم ان سے حدیث لکھتے تھے ان کی تعداد پانچ سو کے قریب تھی۔ بعض لوگ تو صرف ان کے اخلاق و آداب سیکھنے کے لیے آتے تھے۔

ان کا ایک ہم عصر راوی ہے۔ کہ میں ابو عبداللہ کی خدمت میں ۱۳ برس حاضر ہوتا رہا۔ وہ ان اوقات میں اپنی اولاد کے سامنے مُسند پڑھتے تھے۔ مگر میں نے ایک حدیث بھی ان سے نہ لکھی۔ میں ان کی سیرت و اخلاق کے لیے ان کے پاس جاتا تھا۔

امام احمد کا درس

امام احمد کے درس کے دو حصے تھے۔ ایک وقت درس خاص کا تھا۔ جس میں وہ اپنے خاص الخاص شاگردوں اور بیٹوں کو اپنے گھر میں درس دیتے۔ دوسرا عام درس تھا۔ جو مسجد میں ہوتا۔ اور اس میں طالب علم اور عام لوگ شامل ہوتے۔ یہ درس عصر کی نماز کے بعد ہوتا۔

درس کی خصوصیتیں

ان کے درس کی چند خصوصیات تھیں۔ جن کا گہرا اثر دلوں پر پڑتا۔

اوّل۔ ان کی مجلس بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی۔ امام باوجود تواضع و انکسار کے مزاح اور فضول باتوں سے اجتناب کرتے تھے۔ اس کا اثر ان کے

مخاطبین پر بھی پڑتا تا۔ اور وہ بھی ان کی موجودگی میں مذاق و استہزار کی باتوں سے احتیاط کرتے۔ خواہ علمی مجلس ہوتی یا غیر علمی۔ ان کے اساتذہ تک ان کا لحاظ کرتے اور ان کی موجودگی میں مزاح کی بات نہ کرتے۔

ابن سالم کی روایت ہے کہ ہم یزید بن ہارون کی مجلس میں بیٹھے تھے یزید نے کچھ مذاق کی بات کی۔ احمد بن حنبل نے کھنکارا۔ یزید نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"ارے تم لوگوں نے مجھے کیوں نہ بتایا کہ احمد بھی موجود ہیں۔ تاکہ میں مزاح نہ کرتا"۔

حق یہ ہے کہ جس محفل درس میں سنت نبوی، آثار صحابہ اور فتاویٰ سلف صالح کا بیان ہو رہا ہو۔ اس میں مزاح و تفریح کا کوئی محل ہی نہیں۔

امام احمد حقیقت میں جب درس دیتے تھے۔ تو اس کو ایک طرح کی عبادت ہی سمجھتے تھے۔ اور عبادت کے اوقات میں مزاح کا کیا کام ہے۔

دوم۔ دوسری خصوصیت یہ تھی کہ امام احمد طلب کے بغیر درس نہیں دیتے تھے۔ جب کوئی شخص کسی حدیث کے بارے میں سوال کرتا۔ تو وہ اس کے متعلق اپنی کتاب نکالتے۔ اور اس میں دیکھ کر بیان کرتے۔ بہت کم ایسا ہوتا کہ کتاب سے رجوع کیے بغیر حدیث بیان کریں۔ چنانچہ اندازہ لگایا گیا ہے۔ کہ پوری زندگی میں انہوں نے بمشکل ایک سو حدیثیں کتاب دیکھے بغیر بیان کی ہوں گی۔ حالانکہ ان کے درس و افتادی کی مدت چالیس برس کے لگ بھگ ہے۔

امام مسئلہ کس طرح بتاتے تھے ابو حاتم رازی کی روایت ہے کہ میں

سنہ ۲۱۳ھ میں امام احمد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ جب وہ نماز کے لیے نکلے تو ان کے ہمراہ "کتاب الاشربہ" اور "کتاب الایمان" تھی۔ مگر کسی شخص نے ان سے کوئی سوال نہ کیا۔ اور انہوں نے کتابیں گھر بھیج دیں۔ امام موصوف اس لیے کتاب لے کر نکلتے کہ اگر کوئی شخص کوئی بات پوچھ بیٹھے۔ تو وہ اس میں سے دیکھ کر بتا سکیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کا حافظہ کمزور تھا۔ ان کے دیکھنے والوں کا بیان ہے۔ کہ وہ اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ قوی الحافظہ تھے۔

وہ اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کرتے رہتے تھے۔ کہ کتاب دیکھے بغیر مسئلہ نہ بتایا کرو۔ علی بن مدینی کا بیان ہے۔ کہ میرے استاد احمد بن حنبل نے مجھے حکم دیا ہے کہ کتاب دیکھے بغیر روایت نہ کروں۔ ان کی مجلس میں سب سے زیادہ معزز غربا ہوتے تھے۔ اور وہ ان کی طرف خاص طور پر توجہ فرماتے۔

درس کی دو باتیں ان کا درس دو باتوں پر مشتمل ہوتا۔ حدیث کی نقل و روایت اور یہ کتابوں کو دیکھ کر ہوتی۔ دوسرے فقہی فتاوٰی۔ جن کے متعلق ان سے رجوع کیا جاتا۔ پیش کردہ مسائل کو وہ اپنے علم کتاب و سنت سے استنباط کے ذریعے حل کرتے۔ وہ فتوٰی دیتے مگر اپنے فتووں کو مدون کرنا نہ خود جائز سمجھتے تھے نہ شاگردوں کو اس کی اجازت دیتے۔ ایک مرتبہ ان کو اطلاع ملی کہ ان کے بعض شاگرد ان کے فتاوٰی کو خراسان میں بیان کر رہے ہیں۔ انہوں نے سن کر کہا۔

"گواہ رہو کہ میں نے ان سب سے رجوع کیا۔"

ایک خراسانی ان کے پاس آیا۔ اس نے ایک کتاب ان کے سامنے پیش

کی۔ دیکھا تو اس میں ان کے اقوال درج تھے۔ سخت برافروختہ ہوئے۔ اور کتاب
اٹھا کر پھینک دی۔

وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ کہ دوسرے اہل علم کی فقہی آراء کو نقل کیا
جائے۔ ایک شخص نے کتب فقہ نقل کرنے کے متعلق سوال کیا۔ اور انہوں نے
اس سے منع کیا۔ اس نے عرض کیا مگر عبداللہ بن مبارک تو ایسا کرتے ہیں۔
خفا ہو کر جواب دیا۔ کہ ابن مبارک آسمان سے نہیں اترے۔ ہمارا کام یہ ہے
کہ ہم اوپر سے اترے ہوئے علم کو اخذ کریں"۔

محدثین کو امام شافعی کی کتابیں نقل کرنے سے منع کرتے۔ حالانکہ امام شافعی
ان کے استاد تھے۔ اور وہ کہا کرتے تھے کہ امام شافعی اس دور کے مجدد ہیں۔
اور امام عبداللہ بن مبارک کی سیرت کے نقوش قدم کو تو وہ اپنے لیے دلیل راہ
سمجھتے تھے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ منع کرنے کے باوجود لوگوں نے ان کے اقوال
وفتاویٰ کی بڑی ضخیم کتابیں مرتب کیں۔

اتباع صحابہؓ

امام احمد اپنی پوری زندگی میں صحابہ کے متبع تھے۔ ان کا علم
ان کا عمل، ان کی سیرت، ان کے اخلاق۔ ان کی زندگی کا ہر
پہلو صحابہ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ اور وہ ہر اس بحث سے متنفر تھے۔ جو
صحابہ کی دلچسپیوں کے محور سے ہٹی ہوئی ہو۔ ان کی یہی خصوصیت آگے چل کر
اس کار اہم کی تکمیل کا باعث ہوئی۔ جس کے لیے انہوں نے اپنی زندگی کی بازی
لگا دی۔ اور اس میں پورے طور پر فتح مند نکلے۔

مسئلہ خلق قرآن

امام احمد بن حنبل کو جس امر نے شہرت دوام دی۔ اور انہوں نے اپنی زندگی کا جو سب سے بڑا معرکہ سر کیا "وہ مسئلہ خلق قران" ہے اس مسئلے کی ابتدا یوں ہوئی کہ عیسائی مبلغین نے مسلمان علمار کو الجھانے کیلئے یہ طرز استدلال اختیار کیا کہ قرآن مجید کلمات اللہ پر مشتمل ہے۔ اور اللہ کے کلمات اللہ تعالیٰ کی صفات کا ایک حصہ ہیں۔ لہذا یہ کلمات بھی غیر مخلوق ہوئے۔ اور قرآن بھی غیر مخلوق ہوا۔ اب قرآن مجید میں حضرت عیسٰی کو بھی کلمۃ اللہ کہا گیا ہے لہذا وہ بھی غیر مخلوق ہوئے۔ چونکہ غیر مخلوق اللہ ہی ہو سکتا ہے۔ لہذا حضرت عیسٰی بھی اللہ ہوئے۔

امویوں کے عہد میں یوحنا دمشقی ایک مسیحی تھا جو ہشام بن عبدالملک... کے دربار میں ایک اعلیٰ سرکاری منصب پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اپنے مسیحی دوستوں سے کہتا تھا۔ کہ جب کوئی مسلمان تم سے مسیح کے متعلق تمہارا عقیدہ دریافت کرے تو اسے جواب دو۔ مسیح اللہ کا کلمہ ہیں۔ اس کے بعد نصرانی کو مسلمان سے پوچھنا چاہیئے۔ کہ قرآن میں مسیح کو کیا کہا گیا ہے۔ وہ لازماً جواب دے گا مسیح ابن مریم اللہ کے رسول اور اللہ کا کلمہ ہیں۔ جنہیں مریم کی طرف القار کیا گیا۔ اور اس کی روح

(کلمۃ اللہ القاھا الی مریم وروح منہ) جب مسلمان اتنی بات کہہ چکے تو اس سے پوچھو اللہ کا کلمہ یا روح مخلوق ہے۔ یا غیر مخلوق۔ اگر کہے مخلوق تو جواب دو کہ خدا تو اس وقت بھی موجود تھا جب کہ نہ کلمہ تھا نہ روح۔ اگر تم اس انداز سے بحث کرو گے تو مسلمان گھبرا جائے گا۔ کیوں کہ جو مسلمان کلمہ و روح کو مخلوق کہے وہ مسلمانوں کی نظر میں زندیق ہوتا ہے۔ اور اگر وہ کہے کہ غیر مخلوق ہے۔ تو مسیح کا غیر مخلوق ہونا تسلیم کرنا پڑے گا۔

اس طرز استدلال کے جواب میں وہ علم کلام پیدا ہوا۔ جس نے مسئلہ خلق قرآن کے فتنے کو جنم دیا۔ اور امام احمد کو ۱۴ برس تک اس کا مقابلہ کرنا پڑا۔ اس علم کلام نے عیسائیوں کا منہ بند کرنے کے لیے کہا۔

قرآن بھی مخلوق ہے اور مسیح بھی مخلوق ہے

اور اس کے بعد اس پر ایک ردّا اور چڑھا کر کہا

جو قرآن کو غیر مخلوق کہے وہ مشرک ہے

مسئلہ خلق قرآن کی تاریخ

"قرآن مخلوق ہے"۔ یہ فقرہ سب سے پہلے جعد بن درہم نے کہا جو بنی امیہ کے زمانے میں ہو گذرا ہے۔ اس کو خالد بن عبداللہ القسری نے بقرعید کے روز کوفے میں قتل کیا۔ روایت ہے کہ نماز عید کے وقت جعد بن درہم کو بیڑیوں میں جکڑ کر لایا گیا۔ خالد نے نماز پڑھائی۔ خطبہ دیا اور آخر میں کہا۔

"لوگو اب تم جاؤ اور اپنی اپنی قربانی کرو۔ میں آج اپنی قربانی جعد بن درہم کے ساتھ کروں گا۔ کیوں کہ وہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام

نہیں کیا - اور نہ ابراہیم کو اپنا خلیل بنایا۔ تعالیٰ اللہ عما یقولون علوا کبیرًا
اس کے بعد وہ منبر سے اترا اور جعد کو قتل کر دیا۔

"قرآن مخلوق ہے"۔ یہ قول جہم بن صفوان نے بھی کہا تھا۔ اس نے کہا باتیں کرنا اللہ کی صفت نہیں۔ کیوں کہ بات حادث ہوتی ہے۔ اور اللہ کی صفات قدیم ہیں۔ لہٰذا قرآن بھی مخلوق ہے۔ قدیم نہیں۔

اس کے بعد جب معتزلہ کا دور آیا تو انہوں نے صفات معانی کا انکار کیا اور کہا اللہ تعالیٰ متکلم نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جو آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے کلام کیا کلم اللہ موسیٰ تکلیما۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے درخت میں صفت کلام پیدا کی تھی۔ اللہ کلام کا خالق ہے۔ نہ کہ خود متکلم۔ جیسے کہ وہ ہر شے کا خالق ہے۔ لہٰذا قرآن بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ نہ کہ غیر مخلوق۔

خلفائے عباسیہ کے دور میں معتزلہ نے خلق قرآن کو بڑی اہمیت دے رکھی تھی۔ اور اس میں بڑی شد و مد سے بحثیں کرتے تھے۔ بعض فقہا بھی متاثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ بشر بن غیاث المریسی بھی اسی خیال کا تھا۔ جب اس نے اس کا اظہار امام ابو یوسف کے سامنے کیا تو انہوں نے اسے ٹوکا۔ لیکن جب وہ باز نہ آیا۔ تو اسے اپنی مجلس سے اٹھا دیا۔

بحث کی شدت

خلق قرآن کے مسئلہ میں معتزلہ نے بحثوں کی شدت ہارون الرشید کے عہد میں پیدا کی تھی۔ لیکن ہارون عقائد کی بحثوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ بلکہ وہ سختی کے ساتھ ان کو دباتا رہتا تھا۔ کہتے ہیں اسے اطلاع ملی کہ بشر بن غیاث قرآن کو مخلوق کہتا ہے ۔

ہارون نے کہا اگر اللہ نے اسے میرے ہاتھوں میں ڈال دیا تو میں اس کی گردن مار دوں گا۔ بشر نے سنا تو روپوش ہو گیا۔ اور جب تک ہارون زندہ رہا روپوش رہا۔ ہارون نے بعض معتزلیوں کو قید بھی کر دیا تھا۔ لیکن مامون کی آمد پر صورت حال بدل گئی۔ وہ معتزلیوں سے متاثر تھا۔ اور اس کے دربار پر معتزلی چھائے ہوئے تھے۔ معتزلی ہی اس کے حاشیہ نشین تھے۔ اور وہ ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔

کہتے ہیں جب ابوہشام فوطی جو معتزلہ کا امام تھا۔ دربار میں آتا۔ تو مامون اس کی تعظیم کے لیے کھڑا ہونا چاہتا۔

مامون کے تاثر کی وجہ

اس کی وجہ یہ ہے کہ مامون علوم دین میں ابوہذیل علاف کا شاگرد تھا۔ اور ابوہذیل معتزلہ کا امام تھا جب مامون مناظرے کی محفلیں منعقد کرنے لگا تو ان میں معتزلہ کی طراری نے اسے ان کا بالکل ہی گرویدہ بنا دیا اور وہ انہی کی صحبت کو پسند کرنے لگا۔ اور انہی میں سے اپنے وزیر چننے لگا۔ ابوعبداللہ احمد بن داؤد معتزلی کا وہ بہت ہی معتقد تھا چنانچہ اس نے اپنے بھائی "معتصم" کو جو وصیت کی تھی۔ اس میں ایک بات یہ بھی تھی۔

"عبداللہ" ابوعبداللہ بن داؤد کو اپنے سے کبھی جدا نہ کرنا۔ اس سے ہر معاملے میں مشورہ لینا۔ کیوں کہ وہ اس کا مستحق ہے"۔

معتزلہ نے اپنی اس سرکار رسی کا پورا فائدہ اٹھایا اور مامون کو آمادہ کیا کہ خلق قرآن کے بارے میں اپنی حمایت کا اعلان کر دے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح ان کے مسلک کو فروغ حاصل ہو گا۔ اور عوام میں وہ مقبول ہوں گے۔ مامون ان

کے کہنے میں آگیا اور سنہ ۲۱۲ھ میں اس نے اپنے عقیدہ خلق قرآن کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی مجلسوں میں اس عقیدے پر بحثیں کرتا۔ دلیلیں دیتا۔ اور انکو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ تاہم اس نے عوام کو اپنے عقائد کے بارے میں آزاد چھوڑ رکھا تھا۔ اور وہ ان بحثوں سے بے تعلق رہتے تھے۔

مامون سرکاری دباؤ ڈالنے کا ارادہ کرتا ہے

مگر سنہ ۲۱۸ھ میں اس نے یکایک یہ فیصلہ کر لیا کہ لوگوں کو سرکاری دباؤ کے ذریعے عقیدہ خلق قرآن کا قائل کرے گا۔ اس غرض کیلئے اس نے پہلا قدم یہ اٹھایا تھا کہ اپنے گورنروں کے نام جو پیغام بھیجے۔ ان میں حکم دیا کہ فقہاء محدثین کو بلا کر عقیدہ خلق قرآن کی بابت دریافت کریں۔ اور ان کو مجبور کریں کہ وہ قرآن کو مخلوق مانیں۔

اسحاق بن ابراہیم بغداد میں اس کا نائب اور گورنر تھا۔ اس کے نام اس نے اپنا پہلا فرمان بھیجا جس کے آخر میں لکھا کہ

قاضیوں کو اپنے حضور جمع کرو۔ اور امیر المومنین کا یہ پیغام ان کے سامنے پڑھو۔ ان سے خلق قرآن کے متعلق دریافت کرو۔ اور ان کو بتا دو کہ آئندہ وہی قاضی رہے گا جو اس عقیدے کا اقرار کرے گا۔ اور ان کی عدالتوں میں اسی شخص کی گواہی قبول کی جائے گی جو اس کا معتقد ہو۔ پھر جو قاضی نہ مانے۔ اس کی رپورٹ کرو۔

اسحاق بن ابراہیم نے قاضیوں کو اپنے سامنے بلایا۔ اور محدثین کو بھی طلب کیا اور ان لوگوں کو بھی جو فتویٰ تعلیم اور درس کا کام کرتے تھے۔ ان کے سامنے

مامون کا خط پڑھا۔ ان سے خلق قرآن کے متعلق دریافت کیا۔ اور ان کا جواب مع ان کی رپورٹ کے مامون کی خدمت میں روانہ کیے۔ ان کو دیکھ کر مامون نے دوسرا فرمان بھیجا۔ جس میں حکم دیا کہ ان سب کو پھر بلاؤ اور جو خلق قرآن کے عقیدے کو نہ مانے اس کو پابجولاں میرے پاس بھیج دیا جائے۔ تاکہ خود امیر المومنین ان سے گفتگو کرے۔ اور اگر وہ توبہ اور رجوع نہ کریں۔ تو ان سب کو تلوار کے گھاٹ اتار دے۔

والی بغداد اسحاق بن ابراہیم نے فرمان شاہی پر عمل کرتے ہوئے محدثین فقہا اور مفتیوں کو بلایا اور مامون کی دھمکی سنا دی۔ ان میں امام احمد بن حنبل بھی تھے۔

والی بغداد کے سامنے پیشی والی بغداد نے کہا امیر المومنین۔ آپ سے جس بات کا مطالبہ کرتے ہیں اس کا اقرار کر لیجئے۔ اور اپنی جانوں کو عذاب میں نہ ڈالیے۔ یہ سن کر چار کے سوا سب نے سرکاری عقیدہ مان لیا۔

وہ چار جو اس موقع پر نہ ڈگمگائے اور جنہوں نے آخرت کو دنیا پر ترجیح دی یہ تھے۔

(۱) امام احمد بن حنبل (۲) محمد بن نوح (۳) القواریری (۴) سجادہ اسحاق۔ ان کو زنجیریں پہنا دی گئیں۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ اور انہوں نے وہ رات اسی حال میں گذار دی۔ صبح کو ان میں سجادہ اسحاق ٹوٹ گئے۔ اور انہوں نے سرکاری عقیدہ مان لیا اور وہ رہا ہو گئے۔ دوسرے دن پھر وہی بات ان سے

کہی گئی۔ اور وہی مطالبہ کیا گیا۔ چنانچہ القواریری نے بھی رجوع کر لیا۔ اور اس کی بیڑیاں بھی اتار دی گئیں۔ اب دو باقی رہ گئے۔ ان کو پا بجولاں طرطوس کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ جہاں مامون کیمپ ڈالے پڑا تھا۔ رستے میں محمد بن نوح تاب نہ لاکر واصل بحق ہو گئے۔ اور صرف احمد بن حنبل رہ گئے۔ جن کی کمر ہمت پر دعوت حق کا سارا بوجھ آ پڑا۔ جن حضرات نے سرکاری عقیدہ مان لیا تھا ان کو بھی طرطوس میں مامون نے طلب کیا۔ تاکہ ان پر اکرام کی بارش ہو۔

لیکن احمد بن حنبل ابھی راستے ہی میں تھے۔ کہ مامون کا انتقال ہو گیا۔ اور اس طرح احمد بن حنبل کو اللہ تعالیٰ نے قتل ہونے سے بچا لیا۔ اور حق کی جنگ لڑنے کے لیے وہ زندہ رہ گئے۔

ماموں کی وصیت ماموں نے اس دنیا کو چھوڑنے سے پہلے ایک اور کام کیا اس نے اپنے بھائی اور جانشین معتصم باللہ کے نام وصیت کرتے ہوئے اس کو عقیدہ خلق قرآن پر قائم رہنے اور لوگوں کو بجبر اس عقیدے کے منوانے کی تلقین کی۔ وصیت کے شروع میں اس نے کہا۔

"یہ شہادت ہے جو اللہ کے بندے ہارون الرشید کے بیٹے امیر المومنین نے ان لوگوں کے سامنے دی جو اس وقت موجود ہیں۔ اور ان کو اس کا گواہ کیا۔ کہ اللہ عزوجل واحد ہے۔ اس کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے سوا کوئی معبود اور الٰہ نہیں۔ وہی خالق ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے۔ مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی نہیں"۔

اور وصیت کے دوران میں اس نے کہا۔

”اے ابو اسحاق (معتصم) میرے قریب آؤ۔ جو کچھ دیکھ رہے ہو۔ اس سے نصیحت لو۔ اور خلق قرآن کے بارے میں اپنے بھائی کے طریقے پر چلو“

علماؤ محدثین کا امتحان ہوتا ہے

الغرض جب مامون کا پہلا فرمان والی بغداد کے پاس پہنچا تو والی بغداد اسحاق بن ابراہیم نے اس پر عمل کرنے کے لئے فقہاؤ محدثین اور قاضیوں اور دوسرے حکام کو اپنے سامنے بلایا۔

یہ سب حضرات والی بغداد کے سامنے ایک ہی وقت پہنچے۔ اور اس نے دو مرتبہ امیر المومنین کا مکتوب پڑھ کر سنایا۔ تاکہ اس کے مطالب سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔ اس کے بعد ایک ایک کا امتحان شروع ہوا۔

بشر بن ولید سے ”فرمائیے قرآن کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں“۔

”میں نے امیر المومنین کا مکتوب دو مرتبہ سن لیا ہے“۔

”میں یہ نہیں پوچھتا۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ امیر المومنین کے مکتوب کے جواب میں آپ کیا کہتے ہیں۔ یعنی قرآن کیا ہے“۔

”میں کہتا ہوں قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے“۔

”میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا۔ یہ بتائیے کہ قرآن بھی مخلوق ہے“۔؟

”اللہ ہر شے کا خالق ہے“۔

”تو قرآن بھی تو ایک چیز ہے“۔

”ہاں وہ بھی ایک چیز ہے“۔

”تو مخلوق ہوا“۔؟

"قرآن خالق نہیں ہے"۔

"میں آپ سے یہ نہیں پوچھتا۔ میں پوچھتا ہوں کیا قرآن بھی مخلوق ہے"۔؟

"میں جو کچھ کہہ چکا ہوں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہوں گا۔ میں نے امیرالمومنین سے وعدہ کیا تھا کہ اس معاملے میں خاموش رہوں گا۔ اور اس کے علاوہ جو میں نے کہا کچھ اور نہیں کہوں گا"۔

اس پر والی بغداد نے ایک کاغذ نکالا۔ اور پڑھ کر سنایا۔ اس پر لکھا تھا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ احد ہے۔ فرد ہے نہ اس سے پہلے کوئی شے تھی اور نہ اس کے بعد کوئی شے ہوگی۔ اس کی مخلوق میں سے کوئی شے اس کے مشابہ نہیں۔ نہ کوئی شے معنی میں سے۔ اور نہ کوئی چہرہ چہروں میں سے"۔

"ہاں اور میں تو اس سے کم تر باتوں پر بھی لوگوں کو مار رہا ہوں"۔ بشر نے جواب دیا۔

"جو کچھ انہوں نے کہا ہے۔ وہ لکھ لو"۔ والی بغداد نے کہا۔

پھر وہ علی بن مقاتل کی طرف پلٹا۔ اور کہا۔

"اے علی آپ کیا فرماتے ہیں"۔

"میں نے امیرالمومنین کے ارشادات خوب سن لیے"۔

"اس کاغذ کو دیکھیے اور پڑھیے اور بتائیے۔ قرآن مخلوق ہے یا نہیں"۔

"قرآن اللہ کا کلام ہے"۔

"میں یہ نہیں پوچھتا"۔

"قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس کے علاوہ اگر امیرالمومنین ہمیں کسی اور بات کا حکم دیں گے تو ہم سر تسلیم خم کریں گے"۔

"منشی! آپ نے جو کچھ فرمایا وہ لکھ لو" والی بغداد نے حکم دیا۔ پھر وہ ذیال کی طرف متوجہ ہوا۔ اور یہی گفتگو کی۔ انہوں نے ابو مقاتل کے مطابق جواب دیا۔ اس کے بعد اس نے کہا "جناب ابو حسان زیادی آپ کیا فرماتے ہیں"۔

"پوچھئے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔

والی بغداد نے رقعہ سنا کر کہا "آپ نے امیرالمومنین کا پیغام سن لیا۔ اب کیا رائے ہے"۔؟

"جو شخص یہ عقائد نہ رکھے وہ تو کافر ہے"۔؟

"کیا قرآن بھی مخلوق ہے"۔ والی بغداد نے پھر پوچھا۔ اور انہوں نے کہنا شروع کیا۔

"قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اور اللہ ہر شے کا خالق ہے۔ اللہ کے علاوہ ہر شے مخلوق ہے۔ اور امیرالمومنین ہمارے امام اور پیشوا ہیں۔ ہم نے انہی کی وجہ سے علم پایا۔ انہوں نے وہ کچھ سنا جو ہم نے نہیں سنا۔ اور ان کو وہ باتیں معلوم ہیں۔ جو ہمیں معلوم نہیں۔ ہمارے امور و معاملات کو اللہ نے ان کے سپرد کیا۔ اور حج اور نماز کو وہی قائم کرتے ہیں۔ انہی کو ہم اپنے اموال کی زکوٰۃ دیتے ہیں۔ ان کے جھنڈے تلے ہم جہاد کرتے ہیں۔ ان کی امامت ہی ہمارے نزدیک صحیح امامت ہے اگر وہ ہمیں حکم دیں تو ہم مانیں گے۔ اور اگر وہ روکیں گے تو رکیں گے۔ اور بلائیں گے

تو لبیک کہیں گے"۔

والی بغداد نے بگڑ کر کہا "یہ بتایئے قرآن مخلوق ہے یا نہیں"۔

ابو حسان نے پھر وہی بات دہرا دی جو پہلے کہی تھی۔

والی نے کہا "یہ امیر المومنین کا پیغام ہے۔ لیکن انہوں نے اس بات کا لوگوں کو حکم تو نہیں دیا۔ اور نہ وہ اس کی طرف دعوت دیتے ہیں"۔

ابو حسان نے کہا "اگر آپ مجھے یہ بتائیں کہ امیر المومنین نے آپ کو حکم دیا ہے۔ تو میں تعمیل ارشاد کروں گا۔ آپ امیر المومنین کے نمائندے ہیں جو کچھ وہ فرمائیں گے وہی آپ ہم سے کہیں گے۔ اگر انہوں نے حکم دیا ہے۔ تو فرمایئے ہم اقرار کریں"۔

"مجھ سے امیر المومنین نے کوئی حکم دینے کی ہدایت نہیں کی"۔ والی نے عاجز آ کر کہا۔

اس پر علی بن ابو مقاتل نے کہا "اگر حکم نہیں بلکہ رائے ہے تو اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ جیسے صحابہ کرام کا اختلاف رائے فرائض اور مواریث میں کہ انہوں نے کسی ایک رائے کے بارے میں لوگوں کو مجبور نہیں کیا"۔

ابو حسان نے کہا کہ "میرا کام تو سننا اور ماننا ہے۔ حکم دیجیے۔ میں مانونگا"

والی نے کہا "امیر المومنین نے مجھے حکم دینے کی ہدایت نہیں کی۔ مجھے تو صرف دریافت کرنے کی ہدایت ہوئی ہے"۔

امام احمد سے سوال وجواب ان سے فارغ ہو کر والی بغداد امام احمد

بن حنبل کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

"آپ قرآن کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔؟"

"یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے"۔ امام نے فرمایا۔

"کیا وہ مخلوق ہے؟"۔ والی بغداد نے پوچھا۔

"اللہ کا کلام ہے۔ اور اس پر میں کچھ اضافہ نہیں کرتا" امام احمد نے پھر جواب دیا۔

والی بغداد نے امیرالمومنین کا رقعہ دکھایا۔ جب اس کی اس عبارت پر وہ پہنچا

لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ۔

اس کی مثل کوئی شے نہیں اور وہ سمیع اور بصیر ہے۔ تو ایک صاحب نے بطور اعتراض کہا۔

"خدا آپ کا بھلا کرے ——— وہ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ سمیع ہے کان کے ساتھ، اور بصیر ہے آنکھ کے ساتھ" اس پر والی بغداد نے امام احمد سے کہا "اللہ کے قول السمیع البصیر کے کیا معنی ہیں؟"۔

اللہ ویسا ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنے متعلق بیان فرمایا ہے"۔ امام نے جواب دیا۔

"اس کا کیا مطلب ہے"۔ والی نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔ اللہ ویسا ہے۔ جیسا اس نے خود کو بیان کیا"۔

امام احمد کا جواب تھا۔

اس کے بعد والی بغداد نے ایک ایک آدمی سے پوچھا اور سب نے کہا قرآن اللہ کا کلام ہے۔ البتہ ابن بکار اکبر کا جواب یہ تھا کہ قرآن "مجعول" ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّا جَعَلۡنٰهُ قُرۡءٰنًا عَرَبِيًّا۔ اور قرآن "محدث" ہے۔ کیوں کہ ارشاد باری ہے

مَا يَأۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ

اور "مجعول" "مخلوق ہوتا ہے"۔ والی بغداد بول اٹھا۔

"ہاں" ابن بکار نے جواب دیا۔

تو قرآن بھی مخلوق ہوا۔ والی بغداد نے کہا۔

"میں اسے مخلوق نہیں کہتا۔ بلکہ مجعول کہتا ہوں"۔ ابن بکار نے اصرار کیا۔ والی بغداد نے منشی سے کہا ان کا جواب لکھ لو۔

جب والی بغداد پوچھ گچھ اور جوابات قلم بند کرنے سے فارغ ہوا تو ابن بکار اصغر نے کہا

"اللہ آپ کا بھلا کرے۔ یہ دو قاضی سب سے بزرگ ہیں۔ اگر آپ ان کو حکم دیں تو وہ اپنا فتویٰ واضح کر دیں"۔

یہ حضرات امیر المومنین ہی کی بات پہ انحصار کریں گے"۔ والی بغداد نے جواب دیا۔

"اگر آپ ان سے فرمائیں تو یہ حضرات اپنے دلائل کو بیان کر دیں۔ تاکہ ہم ان کو سن کر ان کی طرف سے آگے بیان کر سکیں"

ابن بکار نے کہا۔ مگر اسحاق نے جواب دیا کہ جب موقع آئے گا تو ان سے

دلائل بھی آپ سن لیں گے۔

الغرض والی بغداد نے لوگوں کے جواب لکھ لیے۔ اور پوری فائل امیرالمومنین کے پاس بھیج دی۔ ۹ دن کے بعد اس کا جواب موصول ہو گیا۔ اور والی بغداد نے دوبارہ تمام حضرات کو اپنے سامنے بلایا۔ اور مامون الرشید کا دوسرا فرمان پڑھ کر سنایا۔

مامون الرشید کا دوسرا فرمان

اس فرمان میں مامون الرشید نے نام بنام علماء کا تذکرہ کر کے ان کے ساتھ معاملہ کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مثلاً ابراہیم بن مہدی اور بشر بن ولید کے متعلق حکم دیا تھا کہ اگر توبہ نہ کریں تو ان کی گردنیں مار دی جائیں۔ اور ان کے سر خلیفہ کو بھیج دیئے جائیں۔ اس بنا پر کہ انہوں نے قرآن کو مخلوق نہ کہہ کر شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ مامون نے کسی کو کذاب کسی کو جاہل کسی کو مشرک کسی کو مغرور اور بے وقوف اور کسی کو بندہ درہم و دینار قرار دیا تھا۔ اور نام بنام گالیاں دی تھیں۔ امام احمد بن حنبل کے متعلق لکھا تھا کہ

"تم نے ان کے متعلق جو کچھ لکھا وہ نظر سے گذرا۔ اور ان کی رائے اور مسلک کا علم ہوا۔ اور اس سے ان کی جہالت اور خرابی دماغ کا اندازہ ہوا۔

اس کے بعد آخر میں اس نے والی بغداد کو ہدایت کی تھی۔ کہ علماء میں سے جو عقیدہ خلق قرآن کو نہ مانیں۔ ان کو پابجولاں دربار میں بھیج دیا جائے۔ تاکہ خود امیرالمومنین ان کو عقیدہ تسلیم کرنے کا حکم دیں۔ اور اگر وہ پھر بھی نہ مانیں تو ان سب کی گردن مار دی جائے۔

یہ فرمان "ارجنٹ" تھا۔ تاکہ امیرالمومنین اس کارخیر میں جلدی کر کے ثواب جزیل حاصل کر سکیں۔ اس پر ۲۱۸ھ کی تاریخ تھی۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ صرف چار علما اپنے موقف پر قائم رہے۔ جن کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں پہنا دی گئیں۔ ان میں دو حضرات دو دن میں ٹوٹ گئے۔ تیسرے راہ میں انتقال کر گئے۔ اور صرف امام احمد بن حنبل پا بجولاں دربار تک پہنچے۔ لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ملک الموت نے مامون کی روح قبض کر لی تھی۔ اور جو علمائے حق کو تلوار کے گھاٹ اتارنے کے ارادے کر رہا تھا۔ وہ خود موت کے گھاٹ اتر گیا۔

باصاف دل مجادلہ باخویش دشمنی است
ہرکس کشد بر آئینہ خنجر بخود کشد

کیا یہ مامون کے خطوط تھے؟

محققین کا اندازہ ہے کہ مامون کی طرف سے جو مطبوعہ فرمان والیٔ بغداد کو بھیجے گئے تھے وہ احمد بن ابوداؤد معتزلی کے لکھے ہوئے تھے۔ احمد بن ابوداؤد معتزلی اس وقت مامون کا نفس ناطقہ بنا ہوا تھا۔ اور جیسا کہ سرکاری علماء کا قاعدہ ہے۔ وہ علمائے حق سے انتقام لینے کے لیے سرکاری مشینری کو استعمال کر رہا تھا۔

اس قیاس کے حق میں سرکاری فرمانوں کی اندرونی شہادت پیش کی جاتی ہے۔ اول فرمان طول طویل تھے۔ اور شاہی فرامین ایسے نہیں ہوتے۔ دوسرے ان میں امیرالمومنین کے لیے صیغہ غائب استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی امیرالمومنین حکم

دیتا ہے۔ امیر المومنین کو تمہارا مکتوب پہنچا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرمان اس وقت لکھے گئے جب کہ مامون بستر مرگ پر دراز تھا۔ اور اس کی قوت فکر و ارادہ ماؤف ہو چکی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ خود مامون کو ان کا علم بھی نہ ہوا ہو۔ اگرچہ یہ امکان امکانِ بعید ہے۔

یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ مامون نے وہ احکام اس وقت کیوں صادر نہ کیے۔ جب کہ وہ خود بغداد میں موجود تھا۔ اور اس وقت کیوں صادر کیے جب کہ وہ طرطوس میں پڑاؤ ڈالے پڑا تھا۔ حالانکہ بغداد میں علماء کا امتحان بہت آسان تھا۔ جب کہ سب لوگ اس کے گرد و پیش موجود تھے۔ اور پھر مامون کا عقیدہ خلق قرآن کوئی نئی چیز نہ تھی۔ وہ خلیفہ ہونے سے پہلے بھی اس عقیدے پر تھا۔ اور مناظرے اور مباحثے کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا۔ لیکن اس نے سرکاری دباؤ کے ذریعے اس عقیدے کو منوانے کی کبھی کوشش نہ کی۔ حالانکہ مامون! ۱۹۸ھ ۸۱۳ء میں خلیفہ ہوا۔ اور ۲۱۸ھ ۸۳۳ء میں اس نے انتقال کیا۔

مامون نے مرتے ہوئے اپنے جانشین اور بھائی معتصم کو دو وصیتیں! کی تھیں۔

اوّل۔ مسئلہ خلق قرآن کے بارے میں مامون کے مسلک پر قائم رہے اور لوگوں کو بجبر اس کے منوانے پر آمادہ کرے۔

دوئم۔ احمد بن ابو داؤد پر اعتماد کرے۔ اور اس کے مشوروں پر عمل کرے۔

معتصم صاحب علم آدمی نہیں تھا۔ بلکہ اس کی اصل دلچسپی قلم و قرطاس

کی بجائے تیغ وسنان سے تھی۔ اس نے خود کو تو جنگ وپیکار اور حکومت کے کاروبار میں مشغول کر لیا۔ اور احمد بن ابو داؤد کو کھلی چھٹی دے دی۔ کہ مسئلہ خلق قرآن کے متعلق مامون کی وصیت کو نافذ کرے۔

امام احمد پابجولاں طرطوس کی راہ میں تھے۔ کہ مامون عالم آخرت کو روانہ ہو گیا۔ اور امام احمد معتصم کے سامنے پیش ہوئے۔ معتصم نے ان کو ڈرانے دھمکانے کے جتنے وسائل تھے سب کو استعمال کر دیکھا۔ مگر اس پیکر استقامت اور کوہ صبر وثبات پر کوئی اثر نہ ہوا۔

امام احمد کا موقف

امام احمد کا موقف تھا کہ یہ خلق قرآن کا مسئلہ تم کہاں سے نکال لائے۔ کتاب وسنت میں اس کا کہاں مذکور ہے۔ نفیاً یا اثباتاً اس کے بارے میں کوئی عقیدہ رکھنے کا دین نے کہاں مطالبہ کیا ہے۔ حقیقت میں معاملہ محض ایک مسئلے کا نہیں تھا بلکہ اس اصول کا تھا۔ کہ جن باتوں کا مطالبہ کتاب وسنت نے نہیں کیا ہے۔ ان کو عقائد میں شامل کر کے کسی حکومت کو کیا حق ہے کہ ان کے ماننے پر لوگوں کو مجبور کرے۔ اگر ایک مرتبہ اس "بدعت" کا دروازہ کھل گیا تو پھر ہر بے دین حاکم دین میں بدعتیں پیدا کرے گا۔ اور ان کو عقائد اسلامی میں شامل کرنے کی کوشش کرے گا۔ امام احمد ایک مجدد برحق کی حیثیت میں حفاظت دین کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اور معتزلہ کی گمراہیوں کے طوفان کے سامنے انہوں نے ایسا بند باندھ دیا کہ پھر کوئی طاقت اسے توڑ نہ سکی۔ امام احمد بھی یہ نہیں مانتے تھے کہ قرآن مجید جیسا کہ دفتین میں موجود ہے۔ وہ غیر مخلوق ہے۔ بلکہ ان کا

اصرار اس بات پر تھا کہ اس قسم کے امور کو عقائد میں شامل کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

معتزلہ کے اوہام باطلہ

اس کے برعکس معتزلہ جس مصیبت فکر میں مبتلا تھے۔ وہ علم کلام کی پیداوار تھی۔ ان کو اندیشہ تھا کہ اگر قرآن کو جو کلام ہے غیر مخلوق تسلیم کیا گیا تو حضرت عیسیٰ جو کلمۃ اللہ ہیں۔ ان کو بھی غیر مخلوق ماننا پڑے گا۔ اور عیسائی اس سے فائدہ اٹھائیں گے ۔ دوسرا اندیشہ یہ تھا کہ کہیں لوگ قرآن کو بھی غیر مخلوق ماننے کی وجہ سے اس کی پرستش نہ شروع کر دیں۔ لیکن واقعات نے بتا دیا کہ یہ دونوں اندیشے باطل ثابت ہوئے۔ نہ مسلمانوں نے قرآن کی پوجا کی۔ اور نہ عیسائی اس وجہ سے کوئی فائدہ اُٹھا سکے۔

امام احمد پر ظلم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے

بہرحال جب معتصم نے دیکھا کہ امام احمد پر نہ ترغیب کا اثر ہوتا ہے اور نہ ترہیب کارگر ہوتی ہے۔ تو اس نے تعذیب کا سلسلہ شروع کیا۔ امام احمد ۲۸ ماہ تک قید رکھے گئے۔ کئی بار اتنے کوڑے مارے گئے کہ وہ بے ہوش ہو ہو گئے۔ جب وہ بے ہوش ہو جاتے تو بے درد جلاد تلوار چبھو کر دیکھتے اور جب دیکھتے کہ فی الواقع ان کو کوئی ہوش نہیں تو چھوڑ دیتے اس طرح وہ ۲۸ ماہ ستائے گئے بالآخر جب حکومت ظلم کرتے کرتے تھک گئی اور خود ان ظالموں کو اپنے ظلم پر شرم آنے لگی۔ اور انہوں نے دیکھ لیا کہ اس طرح بھی امام احمد نہیں مانیں گے تو ان کو رہا کر دیا گیا۔ جب ان کو

ان کے گھر پہنچایا گیا تو وہ زخموں سے چور تھے۔ امام احمد کے زخموں کا علاج ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شفا دی۔ اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے ان کے دشمن ناکام ہو چکے تھے۔ عوام میں امام کی محبوبیت عام ہو چکی تھی۔ اور پھر وہ اس قابل ہو گئے تھے کہ مسجد میں درس شروع کر دیں۔ چنانچہ پھر ان کا حلقہ درس قائم ہو گیا۔ معتصم جب تک جیا اس نے ان سے پھر تعرض نہیں کیا۔ اور امام خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ مگر تعذیب کے زمانے کی سختیوں کے باعث مدتوں تک ان کے اعضاء میں درد ہوتا رہا۔

امام احمد کو نظر بند کر دیا جاتا ہے

جب واثق باللہ سریر آرائے خلافت ہوا۔ تو حضرت امام کا دور ابتلاء پھر شروع ہوا۔

لیکن اب واثق اور اس کے مشیروں نے ان کو قید کرنے اور تعذیب کا شکار کرنے کی حماقت نہیں کی۔ بلکہ ان کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ اور درس و تدریس سے روک دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امام پر جتنی زیادہ سختی کی گئی۔ اتنا ہی ان کی شہرت، عزت اور محبوبیت بڑھی۔ مسلمانوں میں وہ محبوب ہوئے اور ان کے مسلک کو فروغ حاصل ہوا۔ حکومت کو یہ بھی اندیشہ ہوا۔ کہ اگر اب کے سختی کی گئی تو ممکن ہے عوام بھڑک اٹھیں لہٰذا واثق نے ان کو بلا کر حکم دیا کہ

"آپ کے پاس کوئی شخص نہ آئے۔ اور نہ آپ اس شہر میں ٹھہریں۔ جہاں میں ہوں"۔

نظر بندی کا یہ سلسلہ پانچ سال تک جاری رہا۔ اور امام درس نہ دے سکے

ایک ظریف کا کارنامہ

معتزلہ نے خلق قرآن کے عقیدے کو جس انداز میں پیش کر رکھا تھا۔ اس سے لوگ تنگ آگئے تھے۔ بلکہ وہ ایک مذاق کا مضمون بن گیا تھا۔

ایک روز خلیفہ واثق باللہ کا درباری مسخرہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا۔

اللہ تعالیٰ امیرالمومنین کو قرآن کے بارے میں صبر جمیل کی توفیق بخشے۔
واثق نے کہا خدا تم سے سمجھے کیا قرآن کی موت واقع ہو گئی؟

مسخرے نے جواب دیا "امیرالمومنین ہر مخلوق پر موت واقع ہونے والی ہے۔ اور قرآن بھی مخلوق ہے۔ آج نہیں تو کل یہ حادثہ ہو کر رہے گا"۔

واثق اس فقرے پر ابھی غور ہی کر رہا تھا کہ مسخرے نے چوٹ کی "امیرالمومنین لوگ تراویح میں کیا پڑھیں گے"۔

واثق کی آنکھیں کھلتی ہیں

واثق بے ساختہ بولا "خدا تجھے غارت کرے اپنی زبان بند کر"۔

ادھر خلق قرآن کے مسئلے کا یہ حال ہو رہا تھا۔ اور ادھر ایک روز ایک بزرگ واثق کے پاس آئے۔ احمد بن ابوداؤد نے ان کو بھی اس عقیدے کی دعوت دی۔ بزرگ نے کہا "جس بات کی طرف دعوت نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی نہ حضرت ابوبکر نے۔ نہ حضرت عمر نے اور نہ حضرت عثمان و علی نے۔ تم اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو۔ اس بارے میں تم دو باتیں ہی کہہ سکتے ہو۔ یہ کہ ان کو اس کا

علم تھا۔ یا وہ اس سے بے خبر تھے۔ اگر تم کہو کہ علم تو تھا مگر انہوں نے سکوت اختیار کیا تو براہ کرم تم بھی سکوت اختیار کرو۔ اور جس طرح انہوں نے لوگوں کو مجبور نہ کیا مجھے بھی مجبور نہ کرو۔ اور اگر کہو کہ ان کو بھی اس کی خبر نہ تھی تو اے گستاخ ابن گستاخ! ذرا سوچ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کو تو اس بات کا علم نہ ہوا اور تجھے ہو گیا"!۔

واثق نے یہ گفتگو سنی تو مجلس سے اٹھ کھڑا ہوا اور بار بار ان الفاظ کو دہراتا رہا۔ اس نے ان بزرگ کو احترام کے ساتھ رخصت کیا اور اب تک جو کچھ کرتا رہا تھا اس سے باز آگیا۔ اور امام احمد پر سے بھی تمام پابندیاں ہٹا لی گئیں۔ اور وہ پھر مسجد میں درس دینے لگے۔ امام احمد پر اس جھگڑے کی وجہ سے ۱۴ برس تک مصائب و شدائد کا ہجوم رہا۔ اور ہر چند ان کے ساتھ اور علماء اور فقہاء بھی آزمائے گئے۔ مگر سب سے زیادہ بار امتحان انہی نے اٹھایا۔ اور فتح و فیروزمندی کا سہرا بھی انہی کے سر رہا۔ رضی اللہ عنہ

امام احمد کا علمی مرتبہ

امام احمد ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں جن کے علم و فضل کا شہرہ ان کے طالب علمی کے زمانے ہی سے پھیل گیا تھا اور جن کے فضل و کمال کا اعتراف ان کی زندگی ہی میں کرایا گیا۔ ابھی وہ طالب علم ہی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ کہ ان کے متعلق احمد بن سعید الرازی نے فرمایا تھا کہ:۔

میں نے کسی نوجوان کو حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حفظ میں اور فقہ

حدیث کے علم میں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہیں پایا۔

ان کے استاذ امام شافعی ان سے فرمایا کرتے تھے:۔

تم صحیح احادیث کے متعلق ہم سے زیادہ علم رکھتے ہو۔ جب کوئی صحیح حدیث ملے تو مجھے بھی بتادیا کرو۔ تاکہ میں بھی جاکر اسے حاصل کروں۔ خواہ وہ کوفی ہو یا مصری یا شامی۔

المزنی امام شافعی کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ وہ فرمایا کرتے تھے

تین باتیں عجائبات زمانہ میں سے ہیں۔ کہ آدمی تو عرب ہے مگر عربی کا ایک جملہ نہیں جانتا جیسے ابوثور۔ عجمی ہے اور عربی زبان میں ایک غلطی نہیں جیسے حسن زعفرانی۔ کم عمر آدمی ہے مگر جب بات کہتا ہے تو اس کی تصدیق بڑے بھی کرتے ہیں۔ جیسے احمد بن حنبل۔

امام شافعی کے ایک شاگرد وطہ بن یحییٰ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:۔

میں بغداد سے نکلا تو میں نے اپنے پیچھے کسی کو احمد بن حنبل سے زیادہ پرہیزگار متقی اور فقیہہ نہیں چھوڑا۔ امام شافعی کے ایک دوسرے تلمیذ محمد بن صباح ہیں۔ وہ کہتے ہیں میں نے احمد بن حنبل اور سلیمان بن داؤد ہاشمی سے زیادہ سمجھ دار کسی کو نہیں پایا۔

امام احمد کے حافظے کے متعلق علی بن المدینی کہتے تھے:۔

ہم میں ابوعبداللہ احمد بن حنبل سے زیادہ کسی کا حافظہ قوی نہیں۔ میں ان کو پچاس برس سے جانتا ہوں۔ وہ بھلائی میں ترقی ہی کرتے گئے ہیں۔

امام احمد کے معاصر اور دوست قاسم بن سلام کا قول ہے کہ:۔

چار آدمیوں نے علم کی حد کر دی۔ احمد بن حنبل۔ علی بن المدینی۔ یحیٰی بن معین۔ اور ابو بکر بن شیبہ۔ ان میں احمد سب سے زیادہ فقیہہ ہیں۔ میں نے ان سے زیادہ سنت کا واقف کسی کو نہیں پایا۔

یحیٰی بن معین کے متعلق قاسم بن سلام کی رائے اوپر دیکھ چکے۔ مگر خود یحیٰی بن معین کی رائے امام احمد بن حنبل کے متعلق کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔ خدا کی قسم جن باتوں کی برداشت احمد کو ہے ہمیں ان کی برداشت نہیں اور نہ ہم احمد کے طریقے پر چلنے کی ہمت رکھتے ہیں۔

عبد الرحمٰن بن مہدی جو امام سفیان ثوری کے ممتاز ترین شاگرد ہیں۔ کہا کرتے تھے۔

جب میں احمد بن حنبل کو دیکھتا ہوں تو سفیان ثوری یاد آجاتے ہیں۔

اور امام سفیان ثوری اپنے عہد میں اتباع سنت، فقہ دین اور زہد و عفاف میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ امام احمد کو ان سے شرف تلمذ حاصل نہیں ہوا۔ اور نہ ملاقات کا۔ بلکہ ان کے شاگردوں سے انہوں نے حدیث حاصل کی۔ لیکن وہ ان کے علم و تقویٰ اور سیرت سے بہت زیادہ متاثر ہوتے اور ان کی سیرت میں امام سفیان ثوری کی سیرت کا پرتو بہت زیادہ تھا۔ امام سفیان ثوری امام ابو حنیفہ کے ہم عصر ہیں امام ابو حنیفہ پر فقہ و قیاس کا غلبہ تھا۔ اور امام سفیان ثوری پر حدیث و سنت۔ اور اس کی اتباع و اقتدار کا۔ جب حدیث مل جاتی تو وہ اس پر جم جاتے۔ البتہ اپنے عہد کے بادشاہ کا مغضوب ہونے میں دونوں مشترک ہیں۔ اور منصب قضاء سے اجتناب کرنے میں بھی دونوں برابر شریک ہیں۔ امام ابو حنیفہ علویوں کے حامی تھے۔ امام سفیان ثوری

کی "علویت" صرف حضرت علیؑ تک محدود تھی۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ شام میں جہاں کوئی شیعہ نہیں تھا وہ حضرت علی کے مناقب بیان کرتے تھے اور عراق میں جہاں حضرت عثمان کا کوئی حامی نہیں تھا وہ حضرت عثمان کی تعریف کرتے تھے۔ کوفہ میں صدیق و فاروق کے فضائل کا ذکر فرماتے۔ اور ناصبیوں کے سامنے حضرت علی کی حمایت کرتے۔ حالانکہ یہ وہ لوگ تھے جو حضرت علی اور ان کے خاندان کے دشمن تھے۔ معاش کے معاملے میں نہایت محتاط تھے۔ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرتے۔ خلفار کے تحائف اور عطیات سے سخت پرہیز کرتے۔ ان کے چچا نے ان کے لیے کچھ میراث چھوڑی تھی جو ان کی ضروریات کے لیے کافی تھی۔ اور امام احمد کی بہ نسبت وہ زیادہ ... خوشحال تھے۔

خدا کے معاملے میں کسی ملامت و مخالفت کی پرواہ نہ کرتے اور نہ کسی طاقت کا رعب مانتے۔ خلیفہ ابوجعفر منصور ایک مرتبہ حرم کعبہ میں تھا۔ اتفاق سے سفیان ثوری بھی وہیں تھے۔ منصور نے ان کا منہ کعبے کی طرف کر کے پوچھا تمہیں رب کعبہ کی قسم تم نے مجھے کیسا آدمی پایا۔

امام سفیان ثوری نے جواب دیا۔ رب کعبہ کی قسم میں نے تمہیں بہت بُرا آدمی پایا

جب ابوجعفر منصور نے بغداد کے علمار کو اپنے سامنے بلایا تھا تاکہ ان کو منصب قضار کے قبول کرنے پر رضامند کرے۔ تو ان میں امام سفیان ثوری بھی تھے۔ اس منصب سے بچنے کے لیے انہوں نے بہکی بہکی باتیں کرنی شروع کر دیں۔ خلیفہ نے ان کو مخبوط الحواس سمجھ کر مجلس سے نکال دیا۔

یہاں سے نکل کر وہ بغداد سے فرار ہو گئے اور جب تک منصور زندہ رہا وہ روپوش

رہے۔ جب مہدی سریر آرائے خلافت ہوا تو واپس آ گئے۔ مگر ان کی حق پسندی اور حق گوئی نے ان کو مہدی کا بھی مقرب ہی رکھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب لوگ خلیفہ کی مدح وثناء اور خوشامد کر رہے تھے۔ امام سفیان ثوری نے اس کے منہ پر حق بات کہہ کر اس کے کبر نفس کو ٹھیس پہنچادی۔

مہدی حج کر رہا تھا۔ اس دوران میں امام سفیان ثوری سے ملاقات ہوئی۔ امام نے اسے سرزنش کی اور کہا حضرت عمر بن خطاب نے جب حج کیا تو ۱۶ دینار خرچ کئے مگر تم نے حج کیا تو بیت المال کو لٹا دیا۔ حق کی یہ کڑوی گولی نگل کر مہدی بدمزہ ہو گیا اور اپنے باپ کی طرح غضب ناک ہوا۔ امام پھر روپوش ہو گئے۔ اور ۱۶۱ھ میں انہوں نے غربت ہی میں انتقال کیا۔ رحمہ اللہ۔ امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے۔ لیکن امام سفیان ثوری کی سیرت اور علم حدیث سے امام احمد نہایت متاثر ہوئے۔ امام سفیان ثوری بھی طلب حدیث میں عراق، شام، حجاز اور یمن میں آتے جاتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کے ایک دوست نے ان سے کہا "سفیان درندوں کا بھی کوئی مسکن اور مستقر ہوتا ہے۔ مگر تمہاری کوئی جائے قرار نہیں"۔

امام سفیان ثوری شہرت کے سخت دشمن تھے۔ اور یہی حال امام احمد کا تھا۔ امام سفیان ثوری اپنے ایک شاگرد کو ایک خط میں لکھتے ہیں تم ایک ایسے زمانے میں ہو کہ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ بھی پناہ مانگتے رہے۔ ان کو وہ اسباب ہدایت میسر تھے جو ہم کو نہیں ہیں۔ ہمارا علم کم۔ ہمارا دامن صبر کوتاہ اور نیکی کے عوامل تھوڑے ہیں۔ اخلاقی فساد بڑھ گیا ہے۔ حالات مکدر ہو گئے ہیں۔ پھر کیونکر ممکن ہے کہ ہم اس زمانے کی برائیوں کا مقابلہ کر سکیں۔ لہٰذا قرن اول کے طریقے پر مضبوطی سے قائم

ہو جاؤ۔ اور گوشہ پسندی اختیار کرو۔ کیوں کہ یہ زمانہ گوشہ پسندی کا ہے۔ غربت کو اختیار کرو۔ لوگوں سے میل جول کم کر دو۔ پہلے دور میں جب لوگ آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے کو نفع پہنچاتے تھے۔ مگر آج وہ حالت نہیں رہی۔ لہٰذا ترک اختلاط ہی میں نجات ہے۔ خبردار امراء سے بچو اور ان کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اور ان کی کسی بات میں ان سے میل جول نہ رکھو۔ خبردار کوئی شخص یہ کہہ کر تم کو دھوکا نہ دے کہ چل کر مظلوم کی سفارش کرو یا ظلم کو روکو۔ کیونکہ یہ شیطان کا دھوکا ہے۔

بے علم عابد اور بدکار عالم سے دور رہو۔ کیونکہ یہ دونوں عظیم فتنے ہیں۔ اگر کوئی تم سے مسئلہ پوچھنے آئے یا فتویٰ مانگنے تو اس پر بس کرو اور مسئلہ بتانے اور فتویٰ دینے میں ریس نہ کرو ان لوگوں کی روش اختیار نہ کرو جو اپنی بات منوانا چاہتے ہیں۔ یا اپنے اقوال کو پھیلانا اور سنانا پسند کرتے ہیں۔

لیڈری سے دامن بچاؤ۔ کیونکہ لیڈری کی ہوس سونے چاندی کی محبت سے زیادہ شدید ہوتی ہے۔"

یہی کردار امام احمد کو پسند تھا۔ وہ عزلت و گوشہ نشینی کو دوست رکھتے۔ رؤسا اور امراء سے دور رہتے۔ مجالس میں بالعموم خاموش رہتے۔ اور مزاح و مذاق کو ناپسند کرتے۔ گویا وہ امام سفیان ثوری —— اپنے روحانی استاد —— کے اس ارشاد کی تعمیل کر رہے ہیں کہ

"علم حاصل کرو۔ جب حاصل کر چکو تو پھر اس کو بچا کر رکھو۔ اس کو ہنسی ٹھٹھول سے ضائع نہ کرو۔ اور لہو و لعب سے اجتناب کرو۔ کیونکہ یہ دل کو زنگ آلود کر دیتا ہے:"

امام احمد امام سفیان ثوری کو اپنا امام اور استاد مانتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے "میرے دل میں ان سے زیادہ کسی کے لیے جگہ نہیں" اپنے شاگردوں سے کہتے۔ جانتے ہو۔ امام کون ہے؟ پھر فرماتے سفیان ثوری۔

یہی وجہ ہے کہ امام سفیان ثوری کے شاگرد رشید عبدالرحمٰن مہدی کہا کرتے تھے "جب میں احمد بن حنبل کو دیکھتا ہوں تو امام سفیان ثوری یاد آ جاتے ہیں"۔

اخلاق و اوصاف

امام احمد کو اللہ تعالیٰ نے ان اوصاف و کمالات سے بہرہ وافر عطا فرمایا تھا جو اس خدمت کیلئے ضروری تھیں۔ جو حق تعالیٰ کو ان سے لینا منظور تھی۔ اس کے لیے سب سے پہلی چیز قوی حافظہ ہے۔ کہ اسی پر علم و نظر کی بنیاد ہوتی ہے۔ اپنی قوت حفظ کے متعلق امام کا اپنا بیان ہے کہ:۔

"میں وکیع سے احادیث ثوری یاد کیا کرتا تھا۔ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ کر گھر جاتے تو راہ میں وہ حدیث بیان کرتے۔ کبھی نو کبھی دس۔ میں ان کو یاد کر لیتا جب وہ گھر میں چلے جاتے تو حدیث کے طالب علم مجھ سے کہتے ہمیں حدیثیں لکھوا دو۔ چنانچہ میں لکھواتا اور وہ لکھ لیتے۔"

امام کے معاصرین ان کو سب سے زیادہ قوی الحافظہ تسلیم کرتے تھے۔ ابو زرعہ سے ایک شخص نے پوچھا مشائخ و محدثین میں آپ نے کس کا حافظہ سب سے قوی پایا۔ بولے احمد بن حنبل کا۔

امام احمد کا حافظہ ہی قوی نہ تھا بلکہ ان کی قوت فہم بھی درجہ کمال کی تھی

جو کچھ پڑھتے یاد کر لیتے اور جو کچھ یاد کرتے۔ اس کو خوب سمجھ لیتے۔ محدثین بالعموم صرف حفظ حدیث پر اکتفا کرتے تھے۔ فقہ و درایت سے انہیں چنداں غرض نہیں تھی۔ گویا احادیث سے استنباط کرنا ان کا کام نہیں۔ بلکہ فقہار کا تھا۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ محدثین کو عطار سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ اور فقہار کو اطبار سے۔ مگر امام احمد عطار بھی تھے اور طبیب بھی۔ اس معاملے میں وہ اپنے زمانے کے محدثین سے ممتاز تھے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث۔ صحابہ کے فتاوی اور آثار اور ممتاز تابعین کے مسائل کو وہ یاد بھی کرتے اور ان کی تہ تک بھی پہنچتے۔

اسحاق بن راہویہ کہتے ہیں۔ عراق میں ہم حدیث کا مذاکرہ کرتے۔ کبھی ایک طریق سے کبھی دو طریقوں سے کبھی تین طریقوں سے۔ احمد بن حنبل، یحییٰ بن معین اور ہمارے دوسرے دوست اس موقع پر موجود ہوتے۔ میں کہتا اس کی کیا مراد ہے۔ اس کی تفسیر کیا ہے۔ احمد بن حنبل کے سوا سب خاموش رہتے۔ حدیث و فقہ دونوں پر ان کو قدرت تھی۔

امام احمد کے ایک شاگرد ابراہیم حربی کہتے ہیں:۔

"میں تین آدمیوں سے ملا ہوں۔ ان کی مثل ہم نے کسی کو نہیں پایا۔ اور نہ مائیں ان جیسا جنیں گی۔

ابو عبید القاسم بن سلام ایک پہاڑ تھے۔ جس میں زندگی پھونک دی گئی ہو۔ بشر بن حارث سر سے پیر تک عقل ہی عقل تھے۔ اور احمد بن حنبل میں نے ان کو ایسا پایا گویا اولین و آخرین کا علم اللہ نے ان کے اندر جمع کر دیا تھا۔ جتنا چاہتے بیان کرتے اور جتنا چاہتے روک لیتے"۔

اولین و آخرین کے علم سے مراد ہے احادیث۔ آثار سلف اور ان کا فہم اور تفقہ
اخلاق فاضلہ میں سب سے نمایاں اخلاق امام کا عزم و ہمت اور صبر و تحمل ہے۔
امام کے اس وصف اخلاق کا مظاہرہ ان کی پوری زندگی میں ہر مرحلے پر ہوتا رہا ہے۔
وہ اپنے وقت کی عظیم ترین حکومت سے بلا تکلف لڑ گئے اور ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ
توڑے گئے۔ مگر ان کی جبین عزم و صبر پر ایک شکن نہ آئی۔ عزم و ہمت اور صبر و تحمل
متعدد اوصاف و محاسن کا مجموعہ ہوتا ہے۔ قوت ارادی۔ حسن نیت۔ اخلاص عمل
توکل علی اللہ اور ایمان کامل کے بغیر کیونکر ممکن تھا کہ امام مامون کے امتحان، معتصم
کے جور و ستم اور واثق کے ظلم و تشدد کا مقابلہ کر سکتے۔

طلب علم جس کی دشوار گذار منزلیں ہوں۔ یا اکل حلال کی پر صعوبت زندگی۔
کلمۂ حق کا اعلان ہو یا سلاطین و امراء کا مقابلہ۔ ہر معاملے میں امام کا عزم و ہمت اور
صبر و تحمل بروئے کار آیا۔ ان کا جسم بھی اتنا ہی مضبوط تھا جتنا ان کا قلب اور ان کا
ارادہ بھی اتنا ہی پختہ تھا جتنا ان کا ایمان، انہوں نے اول روز اپنے لیے جو راہ تجویز
کر لی تھی اس پر پوری استقامت سے گامزن رہے۔ یہاں تک کہ جب مشکلات
و مصائب اور مظالم و شدائد کا دور ابتلا ختم ہوا۔ اور کامیابی و کامرانی کا زمانہ آیا
اور دنیا نے ان کو آسودگی کے ذریعے آزمانا چاہا تو ان کو اس کے لیے بھی بالکل تیار
پایا۔ دنیا اپنی ساری راحتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئی
مگر انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی اس کو نہ دیکھا۔ رزق حلال کا جو معیار انہوں نے پہلے
روز اختیار کیا تھا۔ اس کو آخر وقت تک قائم رکھا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو
خلیفہ متوکل کے احسانات سے اپنا گھر بھر لیتے۔ لیکن ان کے عزم و ہمت اور ان کے

صبر و توکل کو یہ بھی گوارا نہ ہؤا۔ کہ ان کا ہاتھ بادشاہ کے ہاتھ سے نیچا ہو۔

ان کے صبر و اطمینان کا ایک نہایت حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ جس زمانے میں خلافت عباسیہ کے ظلم و تشدد کی بجلیاں ان کے سر پر کوند رہی تھیں۔ اور خلیفہ ان کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ اپنی زبان سے ایک مرتبہ وہ بات کہہ دیں جو خلیفہ کو پسند ہے تو ان کو دہشت زدہ کرنے کے لیے خلیفہ کے سامنے لایا گیا۔ عین اسی وقت ان کے سامنے دو آدمیوں کی گردن ماری گئی۔ خلیفہ کا گمان تھا کہ اس ہولناک منظر کو دیکھ کر ان کا صبر و ہمت جواب دے جائیں گے۔ اور وہ بادشاہ کی بات مان لیں گے۔ ان کا دشمن احمد ابو داؤد بھی موجود تھا۔ اور دیکھ رہا تھا کہ اس ہولناک صورت حال کا کیا اثر ہوتا ہے۔ مگر معلوم ہے امام احمد بن حنبل نے سارے منظر کا کیا اثر قبول کیا۔ اس عالم میں بھی جس شے کا خیال تھا وہ یہ تھی کہ اتفاق سے ان کی نگاہ امام شافعی کے ایک شاگرد پر جا پڑی جو اس جگہ موجود تھے۔ امام نے ان سے پوچھا "موزوں پہ مسح کرنے کے بارے میں تمہیں کوئی حدیث امام شافعی سے یاد ہے"؟۔ لوگوں نے یہ بات سنی تو سناٹے میں آ گئے کہ اللہ اکبر اس صبر و اطمینان اور بے خوفی و بے نیازی کا بھی کچھ ٹھکانا ہے۔ کہ عین اس وقت جب کہ موت سر پر کھیل رہی ہے۔ امام کو دین کی ایک بات اور رسولؐ کی ایک حدیث کے سوا اور کسی چیز کا خیال نہیں۔ خود احمد بن داؤد معتزلی جو اس ابتلاؤ تعزیر کا موجب تھا۔ پکار اٹھا کہ:۔

"اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑنے والی ہے۔ مگر یہ مسائل پوچھ رہا ہے"

احمد بن داؤد جو حکومت و اقتدار کی گود میں پناہ گزین تھا۔ اس کو کیا خبر کہ اہل حق کے طمانیت قلب اور ایمان و یقین کا کیا عالم ہوتا ہے۔

امام احمد کو اللہ تعالیٰ نے جو صبر جمیل عطا فرمایا تھا۔ یہ اس کی غیرت کا تقاضا تھا کہ مرض کی حالت میں درد کی شدت کے باوجود ہائے ہائے نہیں کرتے تھے۔ مبادا یہ بات بھی "صبر جمیل" کے منافی ہو۔

حقیقت میں یہ محاسن اخلاق اللہ تعالیٰ پر ایمان کامل اور مکمل توکل پر مبنی تھے۔ اللہ کے سوا امام اور کسی کو نافع، و مضار اور کارساز و ولی نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کا قلب مومن خدا کے سوا ہر شے کی عظمت و ہیبت سے خالی ہو چکا تھا۔ ہر چیز ان کی نگاہ میں حقیر ہو چکی تھی۔

عفو و درگذر عزم و ہمت اور صبر و استغناء کے اس مقام بلند پر فائز ہونے کے ساتھ امام کا عفو و درگذر بھی درجہ کمال کو پہنچا ہوا تھا بغض و کینہ سے ان کے قلب کا شیشہ بالکل خالی تھا۔ ایک شخص نے ان سے عرض کیا "ابو عبداللہ۔ میں آپ کی غیبت کر بیٹھا ہوں۔ براہ کرم معاف کر دیجئے"۔ امام نے جواب دیا "اگر دوبارہ نہ کرو تو معاف کیا"۔

امام احمد کی گفتگو کے دوران میں ایک شخص نے محسوس کیا کہ وہ امام ابو حنیفہ کی فقہ کے قائل نہیں۔ آدمی متعصب حنفی تھا خفا ہو کر بولا "ابو حنیفہ کا تو پیشاب بھی تمہارے جیسوں سے بہتر ہے" یہ کہہ کر اٹھا اور غصے میں چلا گیا۔ تھوڑی دور جا کر ندامت ہوئی اور واپس آیا۔ اور معافی مانگتے ہوئے بولا "ابو عبداللہ بے اختیاری میں وہ فقرہ میرے منہ سے نکل گیا۔ براہِ کرم مجھے معاف کر دیجئے" امام احمد نے کہا "میں تو تمہیں کبھی کا معاف کر چکا"۔

تواضع و انکسار جہاں تک امراء و سلاطین کے رعب و داب، دولت

نہ مال کی خواہش اور شہرت و ناموری کی ہوس کا تعلق ہے امام احمد بن حنبل کا دل ان سے قطعًا بے نیاز تھا۔ ان کی گردن کبھی کسی کے سامنے خم نہ ہوئی۔ مگر یہ بات غرور و تکبر کی بنا پر نہ تھی۔ بلکہ ایمان و توکل کے باعث تھی۔ فی نفسہٖ امام موصوف نہایت منکسر مزاج اور متواضع تھے۔ ان کے ایک شاگرد کا قول بیان ہو چکا ہے کہ امام احمد کی مجلس میں غریب آدمی جتنا معزز ہوتا تھا اتنا معزز میں نے کسی کی مجلس میں نہیں دیکھا۔ جب وہ نماز عصر کے بعد درس و افتاء کے لیے بیٹھتے تو جب تک سوال نہ کیا جاتا کلام نہ کرتے۔ اور جب مسجد میں جاتے تو آگے بڑھ کر نہ بیٹھتے۔ بلکہ جہاں جگہ مل جاتی وہیں تشریف فرما ہو جاتے۔

نیک نفسی و پاک طینتی

نیک نفسی اور پاک طینتی ان کی فطرت کی بنیاد تھی۔ اپنے دامن عقل کو کسی قسم کی کمزوری کا داغ نہ لگنے دیتے۔ مال غیر سے کلی اجتناب کرتے۔ مشتبہ پیسے کو ہاتھ نہ لگاتے۔ زبان سے وہ بات کبھی نہ نکالتے جو حق پر مبنی نہ ہو اور جس کے وہ قائل نہ ہوتے۔ اور حق کو کبھی نہ چھپاتے خواہ ظلم و تشدد کی بجلیاں ہی سر پہ کیوں نہ آ جائیں۔ دماغ کو ان امور سے ملوث نہ کرتے جن سے سلف صالح نے تعرض نہ کیا تھا۔ یہی حال فقہ کے بارے میں تھا۔ جس مسئلے میں صحابہ کرام کا کوئی فتویٰ ان کو معلوم نہ ہوتا۔ اس میں رائے نہ دیتے اگر دیکھتے کہ صحابہ میں کسی مسئلے میں اختلاف ہے تو جس قول کو زیادہ قرین قیاس پاتے اس کو اختیار کر لیتے۔ اگر نص اور حدیث صحیح نہ ملتی تو مختلف اقوال پیش کر دیتے کہ ضرورت مند جس قول کو چاہے اختیار کر لے۔ الغرض دل، دماغ، زبان، ہاتھ میں سے کسی کو غیر صواب سے آلودہ نہ کرتے۔ فرمایا کرتے کہ "جب آدمی کی سچائی مرجاتی ہے

تو وہ ذلیل ہو جاتا ہے" اور "راستی کے بغیر زندگی ذلیل و خوار ہے"۔

فیاض و سخی اتنے تھے کہ فرمایا کرتے "اگر دنیا اتنی تھوڑی ہو جائے کہ اس کی مقدار ایک لقمہ کی ہو کر رہ جائے۔ اور یہ ایک لقمہ کسی مرد مسلم کو حاصل ہو اور وہ اسے بھی اپنے مسلمان بھائی کے منہ میں ڈال دے تو یہ اسراف نہیں ہوگا"۔

کسی نے پوچھا حضرت مردانگی کیا ہے۔ فرمایا "خوف خدا کی بنا پر خواہشات نفس کو چھوڑ دینا"۔

ہمیشہ عزیمت کا پہلو اختیار کرتے۔ چنانچہ تین خلفائے عباسیہ کے انتہائی تشدد کے باوجود وہ پہلو اختیار نہ کیا جس سے ان کی جان بچ جاتی۔ بلکہ صاف کہہ دیا کہ جس مسئلے میں سلف صالح خاموش ہیں میں اس بارے میں زبان نہیں کھولوں گا۔

بحث و مناظرہ سے اجتناب

اپنے ایمان اور اپنی عقل کو فضولیات سے محفوظ رکھنے کی انتہائی کوشش کرتے۔ چنانچہ اہل بدعت اور پیروان ہوا سے بحث نہ کرتے۔ فرماتے ان مریضان ایمان و یقین سے الجھنے کا نتیجہ وہی ہوگا جو خارش زدہ آدمی کے ساتھ میل جول سے ہوتا ہے۔ یعنی آدمی خود بھی خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اپنے شاگردوں سے بھی کہتے کہ مبتدعین کے ساتھ بحث و جدال سے پرہیز کرو۔ اور شک و ریب کے ہر پہلو سے بچو۔

ایک شاگرد نے پوچھا "ایک صاحب جہمیہ سے مناظرہ کرتے ہیں ان کے عقائد کا رد کرتے ہیں۔ اور ان کے مسائل کی غلطیاں واضح کرتے ہیں۔ ان کے

متعلق آپ کی کیا رائے ہے"۔

فرمایا "میں ان لغو مباحث میں کوئی فائدہ نہیں دیکھتا اور نہ پسند کرتا ہوں کہ ان گمراہوں سے صحبت کی جائے۔ کیا معاویہ بن قرہ کا یہ قول تم نے نہیں سنا کہ جھگڑا ایمان کو ضائع کرتا ہے اور مباحثہ بجز شر کے اپنے اندر خیر کا کوئی پہلو نہیں رکھتا اس لیے اہل جدل و کلام سے دور رہو۔ راہ سنت پر استقامت اختیار کرو۔ اور ان اہل علم کی پیروی کرو جو تم سے پہلے تھے۔ وہ مناظرہ بازی کو برا جانتے اور اہل بدعت سے بحث کرنا پسند نہ کرتے۔ اسی میں سلامتی عقل و ایمان ہے۔ ہم جدل و خصومت کی اجازت نہیں دیتے"۔ پھر فرمایا

"جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ بحثا بحثی کا شوق رکھتا ہے۔ تو اس سے اجتناب کرو"۔

ایک شخص نے امام احمد کو خط لکھا اور پوچھا کہ اہل کلام سے مناظرہ کرنا۔ ان کے پاس اٹھنا بیٹھنا کیسا ہے۔ آپ نے ذیل کا جواب لکھوایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہاری عاقبت بخیر کرے۔ ہم نے اپنے اسلاف سے جو کچھ سنا ہے اور جو کچھ پایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مناظرہ و کلام کو برا جانتے تھے۔ ان کے پاس نہیں بیٹھتے تھے۔ سلامتی ایمان اس میں ہے کہ کتاب اللہ کے سامنے سر تسلیم خم رکھو اور اسی کے دائرہ اطاعت کے اندر رہو۔ قدم اس کی حدود سے باہر نہ نکالو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے اور اہل بدعت سے محبت کرو گے اور میل جول رکھو گے تو انکی دینی گمراہیاں کچھ نہ کچھ تم کو حاصل ہو کر رہیں گی"۔

اس معاملے میں امام احمد رضی اللہ عنہ امام مالکؒ کے مسلک کے پیرو تھے

امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کا مسلک دوسرا تھا۔ وہ مبتدعین سے بحث کرتے اور حجت و دلیل سے ان کا ناطقہ بند کر دیتے تھے۔ لیکن اُن کا مقصود اس سے غلبہ حاصل کرنا اور مناظرے میں جیتنا نہیں ہوتا تھا بلکہ اثبات حق۔ مگر ان کی سی حق پسندی کی توفیق ہر کس و ناکس کو کب ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے خود اپنے لڑکے کو مناظرہ بازی سے منع کر دیا تھا۔

فقہی مسلک فقہ کے معاملے میں بھی اپنا مسلک ہر قسم کی نفسانی آلودگیوں سے پاک رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مسلک پر سختی سے قائم رہتے۔ اور انہی کے ارشادات سے مسائل کا استخراج کرتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اگر کوئی قول منسوب ہوتا تو حتی الوسع اس سے باہر جا کر فتویٰ نہ دیتے۔ الا یہ کہ کوئی دوسرا زیادہ قوی قول اس کے خلاف مل جاتا۔ فرماتے :-

"جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کو رد کر دیتا ہے۔ وہ ہلاکت کے کنارے پر ہے"۔ فرمایا کرتے تھے "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث نہ لکھی مگر یہ کہ اس پر عمل بھی کیا ہے"۔

اگر حدیث نہ ملتی اور نہ صحابہ کا قول و عمل، تو اپنے سے پہلے اہل حق کے فیصلوں سے مسئلے کا استخراج کرتے۔ اور جن مسائل میں پہلوں نے گفتگو نہیں کی ان میں گفتگو کرنے سے منع کرتے۔ چنانچہ شاگردوں سے کہتے "جس مسئلے میں تمہارا کوئی امام اور پیشرو نہ ہو۔ اس میں کلام نہ کرو"۔

اخلاص امام کی زندگی کا بنیادی وصف اخلاص بھی ہے۔ یعنی ہر کام اللہ کی

رضا کے لیے کرنا۔ چنانچہ انہوں نے علم حاصل کیا تو نہ دنیوی مناصب کے لیے نہ شہرت کے لیے۔ نہ مال اور دولت کے حصول کے لیے۔ بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لیے۔ ریا اور شہرت سے انہیں سخت نفرت تھی۔ وہ آرزو کرتے کہ لوگ ان کا تذکرہ نہ کیا کریں۔ دوات تک کو چھپا کر رکھتے کہ کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ ان کو حدیث لکھنے کا کتنا شوق ہے۔ فرماتے "دوات کا اظہار بھی ریا ہے"۔ کہا کرتے میرا جی چاہتا ہے میں مکہ کی پہاڑیوں میں اس طرح کھو جاؤں کہ لوگ پہچان نہ سکیں" یہ بھی کہتے:۔

وہ شخص خوش قسمت ہے جس کا تذکرہ اللہ تعالیٰ محو کر دیتا ہے"۔

یحیٰ بن معین کہتے ہیں "میں پچاس برس امام کی صحبت میں رہا ہوں۔ ہمارے سامنے انہوں نے اپنے صلاح و خیر کے سلسلے میں کبھی فخر کی بات نہیں کی"۔ اپنی عبادات اپنے مصائب اور جو کچھ ان کو پیش آیا۔ اس کا کبھی تذکرہ نہ کرتے۔

رعب و وقار

بڑے بارعب اور باوقار تھے۔ مگر ان کا رعب خوف سے خالی اور احترام سے پُر تھا۔ استاد تک ان کا احترام کرتے۔ ان کے ایک استاد اپنے شاگردوں میں بیٹھے ہوئے کچھ مذاق کر رہے تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ احمد بن حنبل بھی موجود ہیں۔ جب معلوم ہوا تو شاگردوں کو ملامت کی کہ تم نے ان کی موجودگی کی اطلاع کیوں نہ دی تاکہ میں مذاق نہ کرتا۔

سرکاری ملازمین بھی ان کا رعب مانتے تھے۔ جس زمانے میں وہ اپنے مکان میں نظر بند تھے۔ ایک پہرہ دار جس کی ڈیوٹی یہ تھی کہ معلوم کرتا رہے امام مکان کے اندر ہیں۔ ان کے مکان کا دروازہ نہ کھٹکھٹاتا۔ بلکہ ان کے چچا کے مکان کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ اور ادھر سے اندر داخل ہو کر معلوم کرتا۔

ان کے تلامذہ کے دل میں امام کا رعب اور بھی زیادہ تھا۔ مگر اس کے ساتھ ہی انتہائی محبت بھی تھی۔ شاگرد ان سے بحث کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ میں اسحاق بن ابراہیم اور فلاں فلاں بادشاہ کی مجلس میں گیا۔ مگر میں نے کسی کو امام احمد بن حنبل سے زیادہ پر ہیبت نہیں دیکھا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ ان سے گفتگو کروں۔ مگر ان کے چہرے پر نظر پڑتے ہی رعب سے بدن پر لرزہ طاری ہو گیا۔

ابو عبیدہ قاسم بن سلام کہتے ہیں :۔

میں امام ابو یوسف۔ امام محمد بن حسن۔ یحیٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی کی مجلسوں میں بیٹھا ہوں۔ مگر کسی کی ہیبت امام احمد بن حنبل کی سی ہیبت نہیں دیکھی۔ یہ ہیبت وقار خدا کی عطا کردہ تھی۔ یہ ہیبت حق تھی۔ قوت و سلطان کی نہیں بلکہ فضائل اخلاق و وجاہت ان کی تھی۔

اس ہیبت کا راز ان کی کم گوئی میں مضمر تھا۔ وہ اکثر خاموش رہتے۔ کوئی فضول بات نہ کرتے۔ اپنے شاگردوں سے بغیر علم کی بات کے اور کوئی بات نہ کرتے۔

حسن خلق

اس ہیبت و وقار کے باوجود نہایت خوش خلق تھے۔ خندہ جبین۔ نرم خو۔ شیریں زبان۔ شرم و حیا کے پتلے۔ نہ لوگوں سے نفرت کرتے اور نہ بد زبانی۔ بے تکلف اور کریم النفس تھے۔ اپنے اساتذہ کا انتہائی احترام کرتے۔ اور وہ بھی ان کی عزت کرتے۔

امام احمد اسوۂ حسنہ نبوی کی زندہ مثال تھے۔ ان کے اخلاق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے متبع تھے۔ پیروی سنت ان کے رگ و ریشہ میں رچی بسی تھی

سنت ہی کا احیاء ان کی زندگی کا نصب العین تھا اسی پر وہ جئے اور اسی پر مرے اور اسی میں انہوں نے اپنی زندگی کی ساری قوتیں صرف کر دیں۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ ان کی زندگی کا شعار تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

امام احمد کی سیرت و اخلاق کے معمار

امام احمد کی پوری زندگی کی تعمیر میں جن عناصر نے سب سے زیادہ حصہ لیا وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) خاندانی اور نسلی خصوصیات (۲) حدیث و سنت کی تعلیم (۳) اساتذہ اور (۴) شیوخ۔

اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ امام احمد قبیلۂ شیبان کے چشم و چراغ تھے۔ یہ قبیلہ جرأت و شہامت، شجاعت و بسالت، سخاوت و فیاضی، استغنا اور استقامت کے لیے مشہور تھا۔ یہ اوصاف امام کو ورثے میں ملے تھے۔ ان کو صحیح راہ پر لگانے میں ان کے خاندان والوں کو اللہ نے توفیق عطا فرمائی اور انہوں نے احمد بن حنبل کو عالم دین بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ اس صحیح راہ پر ایک مرتبہ چل پڑے تو انکی خداداد صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کا موقعہ مل گیا۔ اس پر ان کو اساتذہ ایسے مل گئے جو اپنے وقت میں امامت و پیشوائی کا مقام رکھتے تھے۔

ان کی عمر ۱۶ برس کی تھی جب کہ وہ طلب حدیث کے لیے ہشیم ابن بشیر بن ابو حازم کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہوئے اور چار یا پانچ برس تک ان کی خدمت میں رہ کر علم حدیث کی تکمیل کر لی۔ اس دوران میں انہوں نے دوسرے ائمہ حدیث سے

بھی تعلیم حاصل کی۔ لیکن امام ہشیم ہی کا زیادہ اثر ان کی زندگی پر پڑا۔

امام ہشیم بن بشیر

ہشیم بن بشیر بن حازم سنہ ۱۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۸۳ھ میں فوت ہوئے۔ بعض تابعین سے انہوں نے تعلیم پائی تھی۔ جیسے عمرو بن دینار۔ اور زہری وغیرہ جو حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن عباس کے آثار کا خصوصی علم رکھتے تھے۔ اور بغداد کے حلقۂ حدیث کے مرکز علمی تھے۔ بڑی پاک باز اور باوقار شخصیت رکھتے تھے۔ اور امام احمد کی طبیعت پر ان کا خاص اثر اور رعب تھا۔ چنانچہ وہ اپنے استاد کے سامنے بہت کم بولتے تھے پوری مدت تعلیم میں ایک یا دو مرتبہ کوئی بات پوچھی ہو گی۔ جب حدیث کی روایت کرتے تو لاالٰہ الااللہ بلند آواز سے کہتے گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بیان کرتے ہوئے جلال نبوی سے ان کا دل معمور ہے۔ ایک حدیث کے ختم ہونے کے بعد دوسری حدیث بیان کرتے تو سبحان اللہ وبحمدہ پڑھتے۔

امام ہشیم کی پوری زندگی علم کے لیے وقف تھی۔ اور علم ہی کے لیے ان کی ساری جدوجہد تھی۔ اس راہ میں انہوں نے بڑی مشقتیں برداشت کی تھیں۔ اور اپنی راہ خود ہموار کی تھی۔ استاد کی یہی خصوصیت امام احمد کی سیرت نے بھی اخذ کی۔ چنانچہ انہوں نے بھی علم حدیث کے حصول میں بڑی محنتیں برداشت کیں۔ اور عظیم مجاہدہ کیا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔

ہشیم بخاری الاصل تھے۔ ان کے والد واسط میں رہتے تھے۔ روایت ہے کہ حجاج بن یوسف کے طباخ تھے۔ جب بغداد منتقل ہوئے تو یہی کام کرتے تھے۔ مچھلی کے کئی قسم کے کھانے بناتے تھے۔ جو خود ان کی ایجاد تھے۔ جب ان کے

بیٹے ہشیم نے علم کی طرف توجہ کی تو باپ کو یہ بات کچھ پسند نہ آئی۔ منع کرتے۔ اور ملامت کرتے مگر بیٹے پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ شوق علم میں سب کچھ صبر سے سنتے اور حدیث کے حاصل کرنے میں مگن رہتے۔ ہشیم قاضی ابو شیبہ کے یہاں اٹھتے بیٹھتے۔ اور ان سے فقہ میں گفتگو کرتے تھے۔ اتفاق سے بیمار ہوئے اور قاضی صاحب کے یہاں نہ گئے قاضی صاحب کو معلوم ہوا تو اہل مجلس سے کہا آؤ ہشیم کی عیادت کو چلیں۔ تمام لوگ قاضی صاحب کے ہمراہ بشیر طباخ کے مکان پر پہنچے۔ اور عیادت کی۔ ہشیم کے والد بشیر طباخ کو معلوم ہوا تو بے حد خوش ہوئے اور بیٹے سے بولے اے بیٹے میں تم کو طلب حدیث سے منع کیا کرتا تھا۔ لیکن آج سے نہیں کروں گا۔ قاضی بغداد میرے گھر آئیں گے مجھے اس کا کب گمان بھی ہوا تھا۔

اس کے بعد ہشیم طلب حدیث کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ پہلے مکہ معظمہ گئے۔ امام زہری سے ملے۔ اور کئی سو حدیثیں ان سے حاصل کیں۔ پھر بصرہ آئے اور کوفہ پہنچے اور بعد میں دوسرے شہروں میں بھی گئے۔ اور اس گوہر مقصود کے لیے بیقرار ہو کر گھومے۔ یہاں تک کہ ان کو وہ مقام علم حاصل ہو گیا کہ بغداد میں وہ نمایاں ترین عالم دین تھے۔ ان کا ایک اپنا علمی حلقہ تھا۔ بڑے بڑے جلیل القدر معاصر علماء ان سے حسد کرنے لگے اور ان کو گرانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ مگر وہ ان کے مرتبۂ احترام میں کمی نہ کر سکے۔ امام مالک بن انس جیسے ائمہ نے ان سے روایت کی ہے۔ حماد بن زید کہتے ہیں "میں نے محدثین میں امام ہشیم سے زیادہ شریف و بزرگ نہیں دیکھا"۔

بعض محدثین ان کو امام سفیان ثوری پر ترجیح دیتے ہیں۔ امام مالک کی رائے تھی کہ عراق میں ان کے سوا کوئی عالم حدیث نہیں ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں "کیا عراق

میں کوئی شخص ہے جو حدیث بیان کر سکے۔ بجز اس واسطی کے"۔

امام احمد بن حنبل امام ہشیم کے درس میں شامل ہوئے اور جو کچھ وہ کہتے۔ اس کو وہ حفظ کر لیتے۔ ان کا اپنا قول ہے "جب تک ہشیم زندہ رہے میں ان کی خدمت میں رہا اور جو کچھ انہوں نے بیان کیا میں نے اس کو ازبر کر لیا" حدیث کی یہی تعلیم آگے چل کر امام احمد کی عظمت و شان کی بنیاد بنی۔

امام شافعیؒ

امام احمد نے امام ہشیم سے حدیث زیادہ فقہ کم حاصل کی، ضروری تھا کہ اس کمی کو وہ کسی دوسرے صاحب کمال کے حلقۂ تلمذ سے پورا کریں۔ ہشیم کی وفات کے بعد امام احمدؒ امام شافعیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اس کا موقع ان کو اس وقت حاصل ہوا جب وہ مکۂ معظمہ حج کے لیے گئے۔ مکۂ معظمہ میں امام شافعی سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کے علم و تفقہ کے گرویدہ ہو گئے۔ امام احمد امام شافعی کی عقل قوت استدلال اور اصول استنباط سے بے حد متاثر تھے۔ اور ان کو ایک لاثانی آدمی سمجھتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہیں "پہلی صدی کے مجدد حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ میرا گمان ہے کہ دوسری صدی کے مجدد امام شافعی رحمۃ اللہ ہیں"

یہ دو اہل کمال تھے جن سے امام احمد نے علم حاصل کیا اور خوب حاصل کیا۔ امام احمد کی زندگی پر جو اہل علم اثر انداز ہوئے ان میں سب سے اہم دو بزرگ ہیں۔ امام سفیان ثوری امام عبداللہ بن مبارک لطف یہ ہے کہ امام موصوف کو دونوں سے شرف تلمذ حاصل نہ ہوا۔

عبدالرحمن بن مہدی کہا کرتے تھے کہ احمد بن حنبل سفیان ثوری کی احادیث کے

سب سے زیادہ جاننے والے ہیں۔ اور ابراہیم بن اسحٰق الحربی فرماتے تھے۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین میں سے جو لوگ سنت کے حافظ تھے ان کی ترتیب یہ ہے۔ سعید بن مسیب۔ سفیان ثوری۔ احمد بن حنبل یعنی اپنے اپنے عہد میں یہ تینوں سب سے زیادہ حافظ سنت تھے۔ امام احمد امام سفیان ثوری سے نہیں ملے۔ بلکہ انہوں نے ان کے تلامذہ سے حدیث حاصل کی۔ امام احمد سفیان ثوری کی احادیث ہی کے حافظ نہیں تھے۔ بلکہ ان کی سیرت کا پرتو بھی ان پر سب سے زیادہ پڑا تھا۔ وہی دنیا سے بے رغبتی۔ وہی سلاطین و امراء سے بے نیازی۔ وہی حق گوئی و بے باکی اور وہی زہد و ورع اور شہرت سے نفرت۔

امام عبداللہ بن مبارک

دوسرے امام عبداللہ بن مبارک ہیں جن کی سیرت سے امام احمد بے حد متاثر تھے۔ ان کا انتقال ۱۸۱ھ میں ہوا۔ یعنی احمد بن حنبل اس وقت ۱۷ برس کی عمر کے تھے۔ وہ خود بیان کرتے ہیں میں سولہ برس کا تھا جب کہ امام ہشیم سے علم حاصل کرنا شروع کیا۔ اگلے سال امام عبداللہ بن مبارک بغداد تشریف لائے۔ یہ ان کی آخری تشریف آوری تھی۔ میں ان سے ملنے کے لیے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ طرطوس چلے گئے۔ اور اسی سال ان کا انتقال ہوگیا۔

امام عبداللہ بن مبارک خاصے دولت مند اور خوش حال تھے۔ ان کا دستِ کرم وسیع تھا۔ نہایت متواضع اور منکسر المزاج تھے۔ ان کی مجلس میں غریب آدمی نہایت معزز رہتا۔ جاہ و منصب اور سرکاری خدمات سے دور رہتے تھے۔ کشور علم اور میدان جہاد دونوں کے بادشاہ تھے۔ ابھی ابھی فقہ و حدیث کی مجلس کو زینت بخش رہے ہیں تو تھوڑی دیر میں علم جہاد اٹھائے ہوئے کفار سے سرگرم قتال ہوگئے۔ کثیر الحج تھے

اور جہاں جاتے ضرورت مندوں کی دست گیری کرتے۔ اور اہل حاجت کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے۔

حج اکبر

امام عبداللہ ابن مبارک ایک مرتبہ حج کو جا رہے تھے۔ راہ میں ایک بستی پر گذرے تو دیکھا کہ ایک لڑکی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر سے ایک مردہ پرندے کو اٹھا رہی ہے پوچھا کیا کرو گی۔ بولی میں اور میرا بھائی تین دن سے بھوکے ہیں۔ بجز اس چادر کے جو میرے بدن پہ ہے ہمارے پاس اور کوئی شے نہیں۔ اور اس گندگی کے ڈھیر کے سوا اور کوئی جگہ نہیں جہاں سے ہم رزق حاصل کرسکیں۔ ہمارا باپ دولت مند آدمی تھا مگر اسے ظالموں نے مار ڈالا۔ اور سب کچھ لوٹ لیا۔ تین دن کی بھوک کے بعد ہم پر مردار حلال ہو چکا ہے۔

امام عبداللہ بن مبارک نے مزدوروں کو واپس بلایا۔ اپنے کارندے سے پوچھا تمہارے پاس کتنا مال ہے اس نے بتایا ایک ہزار دینار۔ فرمایا ۲۰ دینار رکھ لو کہ واپس مرو تک جانے کے لیے ہمیں کافی ہیں اور باقی اس لڑکی کو دے دو۔ اس سال حج کرنے سے یہ بات ہمارے لیے زیادہ افضل ہے۔ اس کے بعد واپس ہو گئے۔

امام موصوف خود روزے سے ہوتے اور دوسروں کو عمدہ کھانے کھلاتے۔ ان کا مال محتاجوں کے لیے تھا۔ اپنی ذات پر بہت کم صرف کرتے۔ طالب علموں کی خاص طور پر اعانت کرتے۔ ان کی سالانہ آمدنی ایک لاکھ دینار تھی۔ جو سب کی سب اہل علم، عابدوں اور فاقہ زدوں پر صرف فرما دیتے۔

اپنے زمانے میں ورع و تقویٰ اور حدیث و فقہ کے امام مانے جاتے تھے۔ معتمر بن سلیمان سے کسی نے پوچھا فقیہ عرب کون ہے۔ فرمایا سفیان ثوری۔ پوچھا پھر؟ جواب دیا عبداللہ بن مبارک۔

آثار و سنن کے بہت بڑے عالم تھے۔ رات رات بھر مطالعہ کرتے۔ کسی نے پوچھا "نماز عشاء پڑھنے کے بعد آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں بیٹھتے"۔ فرمایا "میں صحابہ و تابعین کی خدمت میں چلا جاتا ہوں"۔ اس نے کہا "مگر صحابہ و تابعین اب کہاں؟" فرمایا "چلو اور میرے ذخیرۂ علم کو دیکھو تمہیں ان کے آثار و اعمال مل جائیں گے۔ پھر میں تمہارے پاس بیٹھ کر کیا کروں۔ تم لوگوں کی غیبت کرنے کے سوا اور کیا کرتے ہو"۔

نہایت دولت مند تھے۔ اللہ نے حلال ذریعہ سے رزق فراخی سے دے رکھا تھا۔ مگر لوگوں کو حب دنیا سے روکتے اور کہتے "دنیا کی محبت دل میں ہو اور گناہ اس کو گھیرے رہیں تو پھر اس میں نیکی کدھر سے آئے گی"۔

کہا کرتے زہد ایک ایسی سلطنت ہے۔ جس کے سامنے بادشاہوں کی سلطنت ہیچ ہے۔ زاہد اللہ کے سوا کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اور بادشاہ لوگوں کے دست نگر ہیں۔ ایک شخص نے پوچھا "لوگ کون ہیں۔ فرمایا علماء۔ پوچھا اور بادشاہ؟ جواب دیا زاہد لوگ۔ پوچھا کمینے کون ہیں۔ فرمایا جو دین بیچ کر زندگی گزارتے ہیں"۔

امام احمد ہرچند امام عبداللہ بن مبارک سے نہیں ملے مگر ان کے اخلاق حسنہ اور صفات حمیدہ کی شہرت سنی تھی اور ان کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ امام عبداللہ بن مبارک دنیا سے بے رغبت تھے خود سخاوت کرتے تھے تنگی ترشی سے بسر اوقات کرتے تھے بادشاہوں

امام احمدؒ کا کارنامہ تجدید

امام احمد کو اپنی زندگی کے ۱۴ سال جس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانی پڑی۔ اس کے پیچھے ایک تاریخ ہے۔ معتزلہ جو امام احمد کے ابتلاء و مصیبت کا باعث ہوئے اپنے عہد کی ایک کلامی اور علمی پیداوار تھے۔ خلافت راشدہ کے عہد ہی میں گرد و پیش کی عیسائی اور یہودی اقوام مسلمانوں کے زیر نگیں آ چکی تھیں اور اسلام کو کھلے میدان میں زک دینے سے مایوس ہو کر خفیہ سازشوں میں مصروف ہو چکی تھیں۔ انہوں نے مختلف قسم کے اعتقادی مسائل چھیڑ کر امت میں فتنہ و فساد برپا کر دیا تھا۔ علاوہ سیاسی محاذ کے جس نے علویوں اور امویوں کو ایک دوسرے سے برسر پیکار کر کے مسلمانوں کا خون بے دریغ بہایا تھا بہت سے اعتقادی اور فلسفی مسائل چھیڑے جا چکے تھے۔ علمائے امت نے اس فتنے کا علاج یہ تجویز کیا تھا کہ مسلمانوں کو ان فلسفیانہ موشگافیوں سے الگ رکھا جائے۔ جن کا حاصل فی الاصل کچھ نہیں تھا۔ اور ان کو کتاب و سنت کے مطابق عملاً زندگی بسر کرنے کی تلقین کی جائے۔ لیکن ایک طبقہ علماء ایسا بھی تھا جو ان مسائل سے تعرض کرتا اور ان کا جواب دیتا تھا۔

ان میں معتزلہ پیش پیش تھے۔ یہ لوگ ملحدوں اور کافروں کو انہی کے علم کلام کی دلیلوں سے شکست دیتے۔ اور انہی کے فلسفہ و منطق کے میدان میں ان سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ اس طرز عمل کے باعث ان کو نئے نئے عقائد وضع کرنے

پڑتے تھے۔ ان میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق۔

معتزلہ سمجھتے تھے کہ اگر کوئی مسلمان قرآن مجید کو بھی قدیم مانتا ہے تو وہ خدا کے علاوہ ایک اور شے کو بھی قدیم تسلیم کرتا ہے اور نصاریٰ کو موقعہ دیتا ہے کہ وہ کہیں کہ اس طرح مسیح بھی قدیم ہیں کیونکہ وہ اللہ کا کلمہ ہیں۔ نصاریٰ خدا اور مسیح کو قدیم کہتے ہیں۔ اور مسلمان بھی خدا اور قرآن کو قدیم تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا گمان تھا اس طرح عیسائیوں کو موقع ملتا ہے کہ مسلمانوں کو گمراہ کریں۔ لہٰذا وہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور اس طرح مسیحیوں کا منہ بند کر دیتے تھے۔

دوسرا اندیشہ معتزلہ کو یہ تھا کہ کہیں مسلمان خدا کے ساتھ قرآن کی پوجا بھی شروع نہ کر دیں۔

یہ دو اندیشے ان کو مسئلہ خلق قرآن میں تشدد کرنے پر ابھارتے تھے۔ لیکن اگر وہ اس معاملے میں تشدد نہ کرتے اور علمائے امت کو مصیبت میں مبتلا نہ کرتے تو دنیا میں ان کا منہ کالا نہ ہوتا اور ہمیشہ کے لیے امت ان سے بدگمان نہ ہو جاتی۔ پھر فی نفسہ ان کے یہ دونوں اندیشے بھی باطل تھے۔ کلام الٰہی کو غیر مخلوق ماننے سے نہ مسیحیت کو تقویت ہو سکتی تھی نہ ہوئی اور نہ مسلمانوں نے قرآن کی پوجا کی۔ اور دونوں اندیشے باطل ہی ثابت ہوئے۔

حقیقت میں فلسفیانہ موشگافیوں کے مطابق مسلمانوں کے عقائد کو ڈھالنے سے امت اور اسلام کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ ایک معذرت خواہانہ طرزِ عمل ہے اس کے برعکس اسلام کی تقویت کا باعث یہ امر ہے کہ مسلمان کتاب و سنت پر مضبوطی سے عامل رہیں۔ اور یہی مسلک امام احمد کا تھا۔ ان کا موقف ہی یہ تھا کہ

جب سلف صالحین نے ان مسائل میں مبتلا ہونا پسند نہیں کیا تو آج نئے نئے مسائل اور عقائد پیدا کر کے امت کو ان میں کیوں الجھایا جائے۔ اس قسم کے مباحث میں مشغول ہونے کو وہ فساد دین کا موجب سمجھتے تھے۔

ہو سکتا تھا کہ امام بطور تقیہ سکوت اختیار کرتے۔ لیکن ان کا مسلک یہ تھا کہ تقیہ اگر جائز ہے تو صرف دار الحرب اور دار الکفر میں۔ دار الاسلام میں تقیہ کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ علی الخصوص ائمہ ملت کے لیے تو تقیہ قطعاً درست نہیں۔ جن کے بننے اور بگڑنے پر امت کا بناؤ اور بگاڑ منحصر ہے۔ اگر وہ اپنی جان بچانے کے لیے حق پوشی کریں گے تو پوری امت گمراہ ہوگی اور اس کا وبال ان کے سر ہوگا۔ یہی وہ حق کی عزیمت تھی جس نے امام احمد کو تین خلفاء سے لڑ جانے پر آمادہ کیا اور یہ مردِ حق تن تنہا اس گمراہی کے سیلاب کا مقابلہ کرنے اور اس کا رخ پھیر دینے میں کامیاب ہوگیا جو عباسی خلفاء کی جبروت کے جلو میں اُمڈ رہا تھا۔ رضی اللہ عنہ۔

مجدد کا حقیقی منصب ہی یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کے فتنوں کا جواں مردی سے مقابلہ کرتا ہے اور ان کو شکست دے کر دم لیتا ہے۔ امام احمد کے سامنے معاملہ صرف ایک مسئلہ خلق قرآن کا نہیں تھا۔ بلکہ اس بنیادی سوال کا تھا کہ دین کتاب اور سنت اور آثار صحابہ وسلف صالحین پر مبنی ہے یا فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقی الجھیڑوں سے جو بحثیں پیدا ہوتی ہیں ان کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے۔ نیز یہ کہ مسائل دین میں حجت کتاب وسنت ہیں یا کسی بادشاہ اور اس کے مصاحبوں کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دلیل کے بغیر قوت کے زور سے ایک عقیدہ منوائیں۔

امام احمد نے ۱۴ برس کی سرفروشانہ جدوجہد کے بعد یہ بنیادی حقیقت

تسلیم کرائی کہ دین حق میں کتاب و سنت اور آثار سلف صالحین حجت ہیں نہ کہ کسی بادشاہ کی مرضی۔ اگر اس وقت امام ڈٹ کر کھڑے نہ ہو جاتے اور قوت و جبروت کے سامنے دب جاتے تو قیامت تک کے لیے یہ نظیر قائم ہو جاتی کہ سلاطین و امرا اپنے اوہام و عقائد کو بزور قوت مسلمانوں سے منوالیں۔ اور اصل دین ان کے اوہام و عقائد کے سامنے دب جائے۔ یہ ہے امام احمد کا کارنامہ تجدید۔

"امام اہل السنت"

امام احمد بن حنبل جب اپنے مجاہدہ حق میں کامیاب ہو گئے تو پورے عالم اسلام کی نظریں ان پر مرکوز ہو گئیں، اور وہ علی الاتفاق امام اہل السنت قرار پا گئے۔ اب ان پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ اس اختلاف آرار اور جدل و خصام کے دور میں مسلمانوں کو وہ صحیح عقیدہ بتائیں جو سنت سے ثابت تھا۔ امام احمد متبع تھے۔ فقہ میں بھی اور عقائد میں بھی۔ وہ متشابہات میں نہ نتیجے کے لیے پڑتے تھے نہ حقیقت معلوم کرنے کے نام سے ان میں الجھتے تھے، بلکہ جیسا کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں سراسخون فی العلم کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔ وہ قرآن و سنت کے مطابق ہی فتوی دیتے تھے اور کہتے تھے آمنا بہ کل من عند ربنا (ہم اس پر ایمان لائے یہ سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے) وہ عقائد و اعمال میں صرف کتاب و سنت کو معیار حق تسلیم کرتے تھے اور مصلحت اور فلسفیانہ موشگافیوں میں نہیں پڑتے تھے۔

امام احمد کے زمانے میں پانچ بڑے مسائل تھے۔ جن پر سخت جھگڑے برپا تھے

امام نے ان کے متعلق عقیدہ اہل سنت کی توضیح کی (۱) مسئلہ حقیقت الایمان۔ (۲) مسئلہ تقدیر یعنی انسان کی ذمہ داری کیا ہے۔ اور ارادۂ الٰہی کے بارے میں وہ مجبور ہے یا مختار (۳) گناہوں کی حیثیت کیا ہے کیا ان کا اثر ایمان پر پڑتا ہے گناہ کبیرہ کا مرتکب جنت میں جائے گا یا ہمیشہ دوزخ میں رہے گا (۴) مسئلہ صفات الٰہی۔ اس سے مسئلہ خلق قرآن پیدا ہوا تھا۔ (۵) مسئلہ دیدار الٰہی۔

مسئلہ حقیقت ایمان

اس مسئلے میں مختلف فرقوں نے مختلف پہلو اختیار کر رکھے تھے۔ مثلاً جہمیہ کہتے تھے کہ ایمان مجرد اقرار کا نام ہے۔ اس کے ساتھ عمل لازمی نہیں۔ معتزلہ کہتے تھے اعمال ایمان کا ایک حصہ ہیں۔ اگر کوئی شخص کبائر کا ارتکاب کرے تو باوجود شہادتین کے مومن نہیں ہوگا۔ مگر وہ کافر بھی نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کی حالت کفر و ایمان کے بین بین ہوگی۔ اس کے برعکس خوارج کا عقیدہ تھا کہ اعمال ایمان کا لازمی حصہ ہیں۔ معاصی کبیرہ کا مرتکب مومن نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کافر مطلق ہے اس مسئلے میں اہل سنت کی رائیں مختلف تھیں۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ایمان پختہ اعتقاد یقین کا نام ہے۔ جس نے اس بات کی شہادت دی کہ اللہ ایک ہے اور محمدؐ اس کے رسول ہیں۔ وہ مومن ہے، عمل ایمان کا حصہ نہیں۔ ایمان ایک مجرد حقیقت ہے اس میں کمی بیشی نہیں ہوتی حضرت ابوبکر کا ایمان دوسرے لوگوں کے ایمان کی برابر ہے۔ البتہ حضرت ابوبکر اپنے عمل میں تمام لوگوں پر افضل ہیں۔ اور اس وجہ سے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی۔ عشرہ مبشرہ بھی جنت کی بشارت سے فائز ہیں۔ مگر حضرت ابوبکر ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ حالانکہ بشارت میں سب برابر ہیں

الغرض مومنوں کے مابین فرق ایمان کا نہیں بلکہ اوامر پر عمل کرنے اور نواہی سے اجتناب کرنے کا ہے۔

امام مالک نے فرمایا ایمان تصدیق اور یقین کا نام ہے۔ لیکن اس میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ کیونکہ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بعض مومنوں کا ایمان زیادہ ہو گیا۔ امام مالک یہ بھی کہتے تھے کہ ایمان کو کم بھی ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ قرآن میں صرف مومنوں کے ایمان کے زیادہ ہونے کا ذکر ہے۔ اور کم ہونے کا کوئی مذکور نہیں۔ "لہذا میں اس معاملے میں خاموش ہوں"۔

امام احمد بن حنبل کا مسلک یہ تھا کہ ایمان قول و عمل کے مجموعے کا نام ہے اور کم و بیش بھی ہوتا ہے۔ نیکی تمام تر ایمان ہے۔ معاصی ایمان کو کم کر دیتے ہیں مومن کی تعریف اہل السنت والجماعت کے نزدیک یہ ہے کہ جو گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اور انبیاء و رسل جو تعلیم لائے ہیں۔ وہ حق ہے اور دل سے بھی اس کو صحیح جانے جس کا اس نے زبان سے اقرار کیا۔ اور اپنے اس ایمان میں شک نہ کرے تو وہ مومن ہے"۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں ـــــ "ایمان قول و عمل ہے۔ کم و بیش ہوتا ہے۔ وہ زیادہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی نیک کام کرے۔ اور کم اس وقت ہوتا ہے جب برے کام کرے۔ آدمی ایمان سے نکل کر اسلام میں آتا ہے۔ اور جب توبہ کرے تو پھر ایمان کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ اسلام سے اسی وقت نکلتا ہے۔ جب اللہ کے ساتھ شرک کرے۔ یا اللہ کے فرض کیے ہوئے کسی حکم کا انکار کرے

اس کا تارک ہو جائے۔ لیکن اگر سستی یا غفلت کے باعث ترک فرض کرے تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ چاہے سزا دے چاہے معاف فرما دے"۔

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ امام صاحب کے نزدیک مدارج تین ہیں۔ ایمان۔ اسلام اور کفر۔ اسلام کفر و ایمان کے درمیان واقع ہے۔ ایمان کے ساتھ گناہ کا عمل نہیں یا گناہ کے باعث آدمی اسلام سے خارج نہیں ہوتا اور مسلمان ہی رہتا ہے۔ البتہ اسے مومن نہیں کہیں گے۔ معتزلہ سے امام کا اختلاف یہ ہے کہ معتزلہ اس شخص کو جو گناہ پر مر جائے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخی قرار دیتے ہیں اور امام صاحب اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں چاہے بخش دے چاہے اسے عذاب دے۔ معتزلہ اور ان کے ہم خیال لوگوں سے امام کا یہ اہم اختلاف ہے۔ اور اس معاملے میں امام صاحب نصوص و قطعی پر اعتماد کرتے ہیں۔ اور دوسری کسی بات پر انحصار نہیں کرتے اور مطلقاً انکی حدود کے اندر رہتے ہیں۔

مرتکب کبیرہ کا مسئلہ

اس مسئلے میں خوارج کا مسلک یہ تھا کہ وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر کہتے تھے۔ امام حسن بصری جو تابعی ہیں۔ اسے منافق قرار دیتے ہیں۔ معتزلہ اسے مسلمان تو کہتے تھے۔ مگر دائمی جہنمی کہتے تھے۔ اور امام ابو حنیفہ امام مالک اور امام شافعی مومن ہی تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کرتے ہیں۔ چاہے بخش دے چاہے عذاب دے۔

مرجئہ کا عقیدہ یہ تھا کہ گناہ سے ایمان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جس طرح کفر کو عمل نیک کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اللہ کی رحمت وسیع ہے۔ ایسے مرجئہ بھی تھے جنہوں نے بدکاروں اور بدمعاشوں کے لیے جنت کے دروازے کھول دیئے

تھے۔ اور ان کو ارتکاب معاصی پر دلیر کر دیا تھا۔

امام احمد فقہائے سلف کے متبع ہیں۔ وہ مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

مومن کا کام یہ ہے کہ اس سے جو کوتاہیاں سرزد ہوں ان کو اللہ کے حوالے کرے۔ اپنے معاملے کو اللہ کے سپرد کردے۔ گناہ کے لیے غضب الٰہی کو حرکت نہ دے اور یہ جانے کہ ہر شے اللہ کی قضا و قدر پر منحصر ہے۔ امت محمدیہ میں سے کوئی شخص نہ نیکی کے باعث جنت میں جائے گا نہ گناہ کے باعث دوزخ میں۔ اللہ اپنے بندوں کو جہاں چاہے گا داخل کرے گا۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ہم اہل جنت میں سے کسی کو کسی عمل کی وجہ سے جنت یا دوزخ کا سزاوار نہیں کہتے۔

نیکوکاروں کے بارے میں امید رکھتے ہیں اور گناہ گاروں کے متعلق ڈرتے ہیں اور ان کے لیے مغفرت الٰہی کے امیدوار ہیں۔ جو شخص اللہ سے اس حال میں ملتا ہے کہ اپنے گناہ پر توبہ کر چکا اور اس پر اصرار نہیں کرتا تو اللہ اس کی توبہ قبول فرمائے گا۔ کیونکہ وہ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اور برائیوں کو دور کرتا ہے اور جو شخص اس حال میں مرتا ہے کہ اپنے جرم کی سزا اس نے دنیا میں پالی۔ تو اس کا معاملہ اس کے حوالے ہے۔ چاہے عذاب دے۔ چاہے بخش دے۔"

امام صاحب فرماتے ہیں اہل توحید کی تکفیر نہ کی جائے۔ خواہ وہ کبیرہ گناہ ہوں

کا ارتکاب ہی کریں۔ یعنی ان کے نزدیک اہل قبلہ اپنے گناہوں کی وجہ سے دائمی جہنمی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ چاہے عذاب دے چاہے بخش دے۔

لیکن تارک صلوٰۃ کو امام صاحب کافر قرار دیتے ہیں۔ صرف یہ ایک گناہ ہے جس کے ارتکاب سے کوئی شخص کافر ہو جاتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :۔

"کوئی عمل سوائے نماز کے ایسا نہیں جس کا ترک کفر کا باعث ہو۔ جو شخص عمداً نماز کو چھوڑ دے وہ کافر ہے اور اس کا قتل واجب ہے"۔ یعنی جو شخص نماز کو اس وجہ سے چھوڑ دے کہ وہ اس کا قائل ہی نہیں۔

نماز ضروریات دین میں سے ہے۔ اور ضروریات دین کا انکار بالاجماع کفر ہے" امام صاحب کا استدلال یہ ہے۔ کہ جس زمانے میں فتنۂ ارتداد اٹھا تھا۔ تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس کی سرکوبی کرنے کے لیے فوجیں روانہ کی تھیں تو ان کو ہدایت کر دی تھی کہ مرتدین کی جس بستی سے اذان کی آواز بلند ہو اس پر حملہ نہ کریں۔ یعنی اذان مرتدین کے توبہ کرنے کی علامت اور نشان تھی۔ نماز مظہر اسلام ہے۔ اور اذان اس کی علامت۔ لہٰذا ترک نماز جب کہ انکار کی بنا پر ہو مستلزم کفر ہے۔

تقدیر اور اعمال انسانی

اس مسئلے میں امام احمد کا مسلک یہ ہے کہ وہ تقدیر الٰہی کے معتقد ہیں۔ ان کی اپنی ساری زندگی اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہر تکلیف و راحت کو خوشی سے گوارا کیا۔ ان کا ارشاد ہے :۔

"۔ تابعین اور ائمہ مسلمین اور فقہاء امت کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ ہمارے لیے چھوڑا۔ اس میں اول بات یہ ہے کہ اللہ کی قضا پر آدمی راضی ہو۔ اس کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ اس کے حکم پر صبر کرے اور جن باتوں کا اللہ نے حکم دیا ہے ان پر عمل کرے۔ جن باتوں سے روکا ہے ان سے رک جائے اور جو عمل کرے خالصاً اللہ کے لیے کرے اور تقدیر الٰہی کے خیر و شر پر ایمان لائے۔ اور دین کے معاملات میں جھگڑا اور مناظرہ نہ کرے"

امام صاحب کے نزدیک تقدیر پر ایمان کا یہ تقاضا ہرگز نہیں کہ انسان عمل کے بارے میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے۔ امام صاحب تقدیر کے مسئلے میں بحث وجدال کو پسند نہیں کرتے۔ جب وہ دینی مسائل میں جھگڑے کو ناپسند کرتے ہیں تو مسئلہ تقدیر میں جدل و خصومت تو خصوصیت کے ساتھ انہیں ناپسند ہونی چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلے میں بحث کرنے سے انسان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ جتنا زیادہ بحث کرتا ہے اتنا ہی اس کا دماغ الجھتا ہے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مسلک تھا۔ ان کا ارشاد ہے:۔

"یہ ایسا مسئلہ ہے جو انسانوں پر مشکل ہو گیا ہے وہ اس کا حل تلاش نہیں کر سکتے یہ مسئلہ مقفل ہے جس کی کنجی کھو گئی ہے۔ اگر کنجی مل جاتی تو قفل کھل جاتا۔ اور اب اس کو کوئی ایسا ہی شخص کھول سکتا ہے۔ جو اللہ کے پاس سے اطلاع لے کر آئے اور برہان قاطع لائے"۔

جو لوگ ان کے پاس آ کر اس مسئلے میں گفتگو کرتے تھے۔ ان سے امام ابو حنیفہ فرماتے تھے۔

"کیا تم نہیں جانتے کہ جو شخص سورج کو دیکھتا ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے۔ جو اس کی شعاعوں کو دیکھے۔ وہ جتنا زیادہ دیکھتا ہے اتنا ہی اس کی آنکھیں چندھیاتی ہیں"۔

امام احمد تو سلفی تھے وہ اس مسئلے میں گفتگو کرنا ہی پسند نہیں کرتے تھے اس لیے کہ سلف صالحین نے اس میں گفتگو نہیں کی تھی۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ "تقدیر خیر و شر" پر ایمان لاؤ۔ احادیث جو اس کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔ ان کو سچا جانو اس بحث میں نہ پڑو کہ کیوں ہے اور کیسے ہے۔ اس معاملے میں صرف "تصدیق و ایمان" ہی مناسب ہے۔

امام صاحب قدریوں کے سخت مخالف تھے۔ ان کے بیٹے صالح نے پوچھا قدری کے پیچھے نماز پڑھنا کیسا ہے۔ فرمایا

"قدری کہتے ہیں۔ اللہ کو معلوم نہیں ہوتا کہ بندے کیا کام کرتے ہیں۔ جب تک کہ وہ کر نہ گذریں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کے پیچھے نماز نہ پڑھو"۔

امام صاحب ان مسائل میں غور و خوض کرنے کو بدعت قرار دیتے تھے چنانچہ اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں:۔

"میں مناظرہ باز نہیں ہوں۔ اور اس مسئلے میں صرف اتنی ہی بات کہتا ہوں جتنی کتاب الٰہی اور احادیث (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) یا صحابہ کرام نے کی ہے۔ اس سے زیادہ اس معاملے میں گفتگو کرنا بُرا ہے۔

مسئلہ خلق قرآن

امام احمد اللہ تعالیٰ کی ان تمام صفات کو مانتے تھے۔ جو قرآن میں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں

وارد ہوئی ہیں۔ وہ اللہ کو سمیع، بصیر، متکلم، قادر، صاحب ارادہ، علیم، خبیر، حکیم عزیز تسلیم کرتے تھے۔ اس کی مثل کوئی شے نہیں۔ صفات الٰہی کے متعلق احادیث کو وہ جوں کا توں بیان کر دیتے تھے۔ اور ان کی کنہ و حقیقت میں بحث نہیں کرتے تھے۔ اس لیے کہ ان کے متشابہات میں پڑنا اہل زیغ اور فتنہ پسند وں کا کام ہے

امام احمد اللہ تعالیٰ کو قدیم اور اس کی تمام صفات کو بھی قدیم تسلیم کرتے ہیں اور یہی حال "صفت کلام" کا ہے۔ یعنی وہ بھی قدیم ہے۔

کلام کی بحث سے خلق قرآن کا مسلہ پیدا ہوا۔ اور چونکہ امام احمد صفات الٰہی میں بحث و کلام کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا اس معاملے میں بھی انہوں نے سکوت کو اختیار کیا اور خلفائے بنی عباس کا قول دہرانے سے انکار کر دیا۔

دیدار الٰہی

معتزلہ کہتے تھے قیامت کے روز دیدار الٰہی نہیں ہوگا۔ کیونکہ دیدار جسمانی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جسم سے منسوب کرنا درست نہیں۔ اللہ کی شان "لیس کمثلہ شیئ" ہے اور وہ ان آیات کی تاویل کرتے تھے جو دیدار الٰہی پر دلالت کرتی ہیں۔ مامون الرشید نے قرآن کے مخلوق ہونے کے اعتقاد پر تو ضد کی مگر اس نے معتزلہ کے دیدار الٰہی کے نہ ہونے پر زور نہ دیا۔ ہاں یہ اضافہ واثق باللہ نے کیا۔ اس نے عدم رویۃ الٰہی کی نفی کے اعتقاد پر بھی لوگوں کو مجبور کیا۔ یہ مصیبت توکل کے زمانے میں ختم ہوئی۔ امام احمد رویۃ الٰہی پر ایمان رکھتے تھے۔ اور نصوص کی تاویل نہیں کرتے تھے۔ اور دیدار الٰہی کو اہل سنت والجماعت کا جزو ایمان قرار دیتے تھے۔ تاہم وہ اس بحث میں نہیں پڑتے تھے کہ اس کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس مسئلے میں بحث کرنے کو وہ بدعت اور گمراہی کہتے تھے۔

سیاسی مسلک

سیاسی معاملات میں بھی امام احمد کا مسلک آثار صحابہ پر مبنی تھا۔ وہ اس معاملے میں بھی اثری ہیں۔ خلافت، خلیفہ کون انتخاب کرے اور کس طرح انتخاب کیا جائے۔ ان مسائل میں وہ واقعہ پسند تھے اور فتنوں سے بچتے تھے۔ جو شخص غالب آکر متمکن ہو جائے اس کو واجب الاطاعت سمجھتے تھے۔ خواہ وہ ظالم ہو اور اس کے خلاف خروج کو درست نہیں جانتے تھے۔ اس معاملے میں ان کا مسلک اور امام مالک کا مسلک ایک تھا صحابہ کے مرتبے کی ترتیب بھی دونوں کے نزدیک ایک ہی تھی۔ ان کی رائے تھی کہ خلیفہ کے خلاف خروج اس سے زیادہ فتنے برپا کرتا ہے۔ جتنا ظلم ایک ظالم خلیفہ کرتا ہے۔

امام احمد نے خلفاء کے جھگڑوں میں کوئی حصہ نہ لیا۔ چنانچہ امین و مامون کی جنگ میں انہوں نے کسی کا ساتھ نہ دیا۔ اس کے بعد جب مامون برسر اقتدار آگیا تو ہر چند اس کے دور میں فارسی عنصر غالب آگیا۔ خود امام احمد پر بے حد و حساب ظلم ڈھایا گیا۔ مگر انہوں نے اس کے خلاف خروج کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور لوگوں کو اس سے روکا۔

سیاسی معاملات کے متعلق امام کے زمانے میں جو مسائل ابھرے ہوئے تھے وہ یہ تھے۔

صحابہ کے متعلق رائے صحابہ کی فضیلت کی ترتیب۔ ان کو گالی دینے والے کے متعلق فتوٰی انتخاب خلیفہ۔ خلیفہ کے خلاف خروج۔ اس کے ساتھ ہو کر جہاد کرنا۔

امام صاحب کا مسلک یہ تھا کہ جو شخص صحابہ کو گالی دیتا ہے اس کا اسلام مشکوک ہے۔ بلکہ وہ مسلمان نہیں۔

ان کے بیٹے عبداللہ کی روایت ہے کہ میں نے اپنے والد سے پوچھا "رافضی کون ہے"؟

فرمایا جو شخص ابوبکرؓ و عمرؓ کو گالی دے یا برا کہے۔ میں نے پوچھا جو صحابی کو گالی دے اس کے متعلق کیا رائے ہے۔ ــــــ فرمایا "میں اسے مسلمان نہیں سمجھتا"۔

امام فرماتے ہیں۔ جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ کسی صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ذکر برائی سے کرتا ہے تو اس کے اسلام میں شک کرو۔

صحابیت کے متعلق امام کا مسلک بے حد وسیع ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

"ہر وہ شخص جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سال۔ ایک ماہ ایک دن یا ایک ساعت بھی دیکھا ہے وہ صحابی ہے۔ اس کی قدر و منزلت اس مدت کے مطابق ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا۔ حضور کے ارشادات سنے یا حضور کے رخ انور کو دیکھا۔ جس شخص نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جھلک دیکھی ہے وہ اسی کے برابر صحابی ہے۔ اور صحابہ میں جو سب سے کم رتبے کا ہے وہ ان تمام لوگوں سے افضل ہے جس نے حضور صلعم کو نہیں دیکھا۔ خواہ وہ اللہ کے پاس تمام اعمال صالحہ لے کر جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھے وہ تابعین سے افضل ہیں۔ خواہ ان تابعین نے تمام نیک اعمال کیے ہوں۔ جو شخص کسی صحابی کی تنقیص کرے اور اس کے کسی فعل کی بنا پر اس سے بغض رکھے وہ بدعتی اور گمراہ ہے جب تک سب صحابہ کے لیے دعائے رحمت نہ کرے اور اس کا دل ان سب کی

طرف سے صاف نہ ہو جائے۔

ترتیب میں بھی وہ سلف کے متبع ہیں۔ افضل الصحابہ حضرت ابوبکر۔ ان کے بعد حضرت عمر۔ اور پھر حضرت عثمان۔ اس کے بعد اصحاب شوریٰ کا مقام ہے۔ یعنی حضرات علی زبیر، طلحہ عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد رضی اللہ عنہم، یہ سب خلافت کے مستحق تھے اور سب امام اور راہ نما ہیں۔ اس معاملے میں وہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے قول پر عمل کرتے ہیں۔ ان سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ہم اس طرح گنتے تھے۔ ابوبکر، عمر، عثمان اس کے بعد ہم خاموش ہو جاتے تھے۔

اصحاب شوریٰ کے بعد کی ترتیب یہ ہے۔ مہاجر۔ اہل بدر۔ پھر انصار اہل بدر۔ اس کے بعد تمام دوسرے صحابہ۔

امام احمد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت شرعیہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے کہ "جو شخص حضرت علی کی خلافت کو نہیں مانتا وہ گدھے سے زیادہ گمراہ ہے۔

حضرت علیؓ حدیں قائم کرتے تھے زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔ اور جیسا کہ اس کا حق ہے تقسیم کرتے تھے۔ معاذ اللہ کیا ان کو خلیفہ برحق نہ مانا جائے گا۔ وہ اچھے خلیفہ تھے۔ ان سے اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم راضی تھے۔ ان کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ ان کے ساتھ ہو کر جہاد کرتے تھے۔

ان کی امارت میں حج کرتے تھے۔ ان کو امیر المومنین کہہ کر خطاب کرتے تھے۔ ہم بھی انہی کی پیروی کرتے ہیں"۔

متوکل کے زمانے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مخالفت شدت اختیار کر گئی تھی۔ متوکل خود ناصبی یعنی حضرت علی سے عداوت رکھنے والا تھا۔ امام احمدؒ ان لوگوں کی سخت مخالفت کرتے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف طعنہ زنی کرتے تھے امام احمدؒ ان کی خلافت کی حمایت اور ان کے فضائل ومناقب کو بیان کرتے تھے ان کا قول ہے:۔

"خلافت سے علیؓ کی زینت نہیں۔ بلکہ علیؓ سے خلافت کی زینت ہے"۔

دوسرا قول ہے ـــــ "علی بن ابی طالب اہل بیت میں ہیں۔ ان کو دوسروں پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے"۔

تیسرا قول ہے "کسی صحابی کی فضیلت میں اتنی صحیح حدیثیں نہیں۔ جتنی حضرت علیؓ کے حق میں ہیں۔

لیکن اس کے باوجود وہ ان صحابہ پر زبان طعن دراز نہیں کرتے تھے۔ جو حضرت علی کے مخالف تھے۔ کسی نے پوچھا علیؓ و معاویہؓ کے بارے میں کیا ارشاد ہے۔ فرمایا "میں ان سب کے بارے میں اچھی بات ہی کہتا ہوں۔ اللہ سب پہ رحم فرمائے۔ معاویہؓ عمروؓ بن العاص۔ ابوموسیٰؓ اشعری سب اچھے تھے۔ ان کی تعریف اللہ نے اپنی کتاب میں فرمائی ہے۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجودؔ"۔

ایک ہاشمی نے ان سے علیؓ و معاویہؓ کی نزاع کے متعلق رائے دریافت کی۔ امام احمد نے جواب سے پہلوتہی کی۔ جب معلوم ہوا کہ ہاشمی ہے تو فرمایا پڑھو۔ تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت ولکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون

امام موصوف کے سامنے کسی شخص نے امام شافعی پر الزام لگایا کہ وہ شیعہ ہیں

کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے باغیوں کے متعلق اسلامی احکام حضرت علی رضی اللہ عنہ کے معاویہ وخوارج کے خلاف جنگ کرنے سے اخذ کیے۔ امام نے جواب دیا:

"حضرت علیؓ صحابہ میں سے پہلے امام ہیں جن کو "خروج" سے آزمایا گیا۔ امام شافعی کو اس وجہ سے شیعی کہنا درست نہیں کہ ان کے قول سے حضرت معاویہ برسر ناحق ثابت ہوتے ہیں"۔ امام احمد نے فرمایا "یہ بات، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول سے ثابت ہے کہ حضور نے عمار بن یاسر سے فرمایا کہ تمہیں ایک باغی گروہ قتل کریگا۔ چنانچہ عمار کو معاویہ کے لشکر نے قتل کیا تھا۔ اس اثر سے حضرت معاویہ باغی قرار پاتے ہیں۔ لیکن اس اعتقاد کے باوجود امام احمد یہ دیکھ کر کہ حضرت معاویہ رضؓ کے ساتھ صحابہ کا ایک گروہ بھی تھا ان کے تذکرے سے اجتناب کرتے تھے۔ اور ان کے خلاف کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں صحابہ کے طریق عمل کی پیروی کرتے ہیں۔

انتخاب خلیفہ امام احمد حضرت ابوبکرؓ کو اس وجہ سے خلیفہ اول مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو مرض الموت میں نماز پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو نامزد کیا۔ حضرت عمر نے چھ صحابہ کی انتخابی مجلس بنادی اور مسلمانوں کو حق دیا کہ وہ ان میں سے کسی کو خلیفہ چن لیں۔ چونکہ صحابہ نے یہ طریقہ اختیار کیا اس لیے امام احمد اسی ترتیب کو اور اسی طریق کو صحیح سمجھتے ہیں۔

امام احمد خلیفہ کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ اپنے بعد کسی شخص کو ولی عہد مقرر کردے اور مسلمانوں کو اختیار ہے کہ خلیفہ کے مرنے کے بعد ولی عہد کی بیعت کریں یا نہ کریں

ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو، حضرت ابوبکر نے حضرت عمر کو اور سلیمان بن عبدالملک نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو اپنے بعد نامزد کیا تھا۔ فرماتے ہیں:۔

"اگر امام مر جائے اور کسی شخص کو جانشین مقرر نہ کر جائے تو جو شخص امامت کا مستحق ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی امامت کی دعوت دے۔ جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن زبیر نے کیا۔"

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"ائمہ کی سمع و طاعت واجب ہے۔ جو شخص خلافت و حکومت پر مسلط ہو جائے اور لوگ اس پر رضامند ہو جائیں خواہ وہ نیک ہو یا بد وہ بہرحال امیر المومنین ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد روز قیامت تک امرائے مسلمین کے جھنڈے تلے واجب ہے۔ خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ اسی طرح مال فے کی تقسیم اور حدود شرعی کا نفاذ امرائے مسلمین کا کام ہے۔ اور ان پر طعن کرنا یا ان سے نزاع کرنا درست نہیں۔ زکوٰۃ و صدقات بھی ان کو ادا کیے جائیں گے اور وہ شرعاً ادا ہو جائیں گے اس سے کچھ بحث نہیں کہ وہ نیک ہیں یا بد۔ اسی طرح نماز جمعہ ان کے پیچھے ادا ہو جائے گی، اور جو نماز جمعہ لوٹائے گا وہ بدعتی ہے۔ تارک آثار ہے۔ اور سنت کا مخالف ..... جو شخص مسلمانوں کے حکمرانوں میں سے کسی کے خلاف بغاوت کرے گا اس کے بعد کہ اس پر مسلمان مجتمع ہو گئے ہوں اور اس کی خلافت کو رضامندی یا مجبوری سے تسلیم کر لیا ہو تو وہ شخص مسلمانوں کی قوت کو توڑنے والا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا مخالف ہوگا۔ اگر مر جائے گا تو جاہلیت کی موت مرے گا۔"

امام احمد مسلمان حکمرانوں کے خلاف خروج و بغاوت کو ناجائز ٹھیراتے ہیں۔ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے ان کی اصلاح کی ترغیب دیتے ہیں۔ امرائے ملت کی اطاعت کو واجب قرار دیتے ہیں۔ مگر معصیت الٰہی میں وہ اطاعت کے قائل نہیں۔ خدا کی نافرمانی کی صورت میں بندے کی اطاعت ناجائز ہے۔ چنانچہ جب خلفائے عباسی نے ان سے مطالبہ کیا کہ وہ قران کو مخلوق کہیں تو انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ہر قسم کی مصیبت کو لبیک کہا۔ اس قسم کی مخالفت کو وہ خروج و بغاوت نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک طریق سنت یہ ہے کہ "ارباب حکومت کے جھنڈے تلے جمع رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ ظلم کریں یا عدل۔ اور تلوار لے کر ان کے خلاف کھڑا نہیں ہونا چاہیئے"۔

"بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملانا اطاعت نہیں۔ بلکہ ریاؤ و نفاق ہے"۔

امام مالکؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔ بلکہ وہ سلاطین و امراء سے مل کر ان کو نصیحت بھی کرتے رہتے۔ لیکن امام احمد امراؤ سلاطین سے کلی اجتناب کرتے تھے۔ اور عامۃ المسلمین کی اصلاح کی کوشش میں منہمک رہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے عہد میں معتزلہ عباسی خلفاء پر مسلط ہو گئے تھے۔ اور براہ راست ان کی اصلاح کے دروازے بند ہو گئے تھے۔ لہٰذا امام احمد نے اپنی پوری توجہ ملت کی اصلاح پر مرکوز کر دی کہ رعیت نیک ہو تو راعی بھی لازماً نیک ہو جاتا ہے۔

امام احمد خلافت و حکومت کو کسی قبیلے یا قوم میں محدود نہیں کرتے۔ بلکہ جس شخص کے ہاتھ پہ امت بیعت کر لے۔ وہ واجب الاطاعت حاکم ہو جاتا ہے۔

امام احمد کا علمی کام

امام احمد کی مُسند ان کی اہم ترین تالیف ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ۱۶ برس کی عمر سے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تھا۔ اور تمام عمر یہ کام جاری رکھا۔ انہوں نے نہ اس کے باب باندھے نہ کوئی خاص ترتیب مقرر کی۔ بلکہ متفرق کاغذوں پر مسودہ لکھتے گئے۔ جب محسوس کیا کہ وقت آخر قریب ہے تو اپنے بیٹوں اور خاص خاص شاگردوں کو بلایا اور جو کچھ لکھا تھا پڑھ کر سنایا۔ اور املا کرا دیا۔

ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے عبداللہ نے اسے مرتب کیا۔ اور اپنے باپ سے اس کے علاوہ جو احادیث سنی تھیں ان کو بھی اس میں شامل کر دیا۔

مسند کی روایات کو امام احمد ہمیشہ چھانٹتے رہتے تھے۔ اور متن اور اسناد کے لحاظ سے جس روایت کو کمزور پاتے تھے نکال دیتے تھے۔ چنانچہ ایک حدیث کو نکالنے کی وصیت انہوں نے مرتے وقت کی۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت کو یہ قبیلہ قریش ہلاک کرے گا اس پر لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ ہمیں کیا حکم فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا کاش لوگ ان کو معزول کر دیتے"۔ امام کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں میں نے والد کے مرض الموت میں اس حدیث کے متعلق پوچھا۔ جواب دیا اس حدیث کو نکال دو۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری احادیث کے خلاف ہے۔

حنبلی مذہب کی اشاعت

مذہب حنبلی اپنے اصول وقواعد کے اعتبار سے تمام مذاہب میں وسیع مذہب تھا۔ لیکن اس وسعت کے باوجود اس میں ایک شدت بھی پائی جاتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ امام احمد اپنی ذات کے معاملے میں سخت شدت پسند تھے۔ جیسا کہ ان کی زندگی کے واقعات سے ثابت ہے۔ وہ سلف صالحین کے آثار کی نہایت سختی سے پابندی کرتے تھے۔ معاش کے معاملے میں کسی قسم کی نرمی اور رخصت کو اختیار نہیں کرتے تھے۔ اور اپنے دین ایمان اور شرافت نفس کی حفاظت بڑی بے جگری سے کرتے تھے۔ مالِ خلفار کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ امرار کے تحفے اور ہدیے قبول نہیں کرتے تھے مکانوں کے کرائے کی زکوٰۃ کے قائل نہیں تھے۔ مگر چونکہ ان کو روایت پہنچی تھی کہ صحابہ اس کی زکوٰۃ وصول کرنا جائز سمجھتے تھے۔ اس لیے اپنی ذات کی حد تک اس کو واجب قرار دے رکھا تھا۔ خلفار کے دیئے ہوئے مال سے دوسروں کے لیے حج کرنا جائز مانتے تھے۔ مگر خود اس سے حج کرنا تو درکنار اس کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔

جنابلہ نے شافعیوں پر سختی شروع کر دی۔ اور شیعیوں کی بھی گت بنائی۔ اس الزام میں کہ وہ اپنے ائمہ کی تقدیس کرتے تھے۔ اس پر خلیفہ نے ان کو ڈانٹا ان پر سختی کی ان کو ڈرایا، دھمکایا اور حکم دیا کہ مناظرے نہ کریں اور ان کو مجبور کیا کہ وہ اپنے مذہب کو چھپائیں۔ اس وجہ سے حنبلی مذہب کے پیرووں سے تشدد منسوب ہو گیا۔ عام طور پر اس کی شہرت ہو گئی۔ کہ یہ لوگ نہایت تنگ نظر اور متشدد ہیں۔ اس کے علاوہ طہارت ونجاست کے معاملے میں بھی حنابلہ کا مسلک بہت سخت تھا

اور وہ اس معاملے میں اتنے بدنام ہو گئے تھے کہ جو شخص طہارت و نجاست کے معاملے میں وسوسہ پسند نظر آتا اسے لوگ حنبلی کہنے لگتے۔

ان اسباب کی بنا پر حنبلیت بہت کم پھیلی۔ ابتدائی صدیوں میں بھی اس کا دائرہ تنگ رہا۔ اور بعد کی صدیوں میں بھی حنبلیوں کی تعداد اور ان کا اثر کم رہا ان میں اہل علم و اجتہاد تو بہت ہوئے مگر عام لوگوں میں حنبلیت مقبول نہ ہو سکی، حنبلیوں کی قلت تعداد پر کسی شخص نے طعن کیا تو ایک شاعر نے ذیل کا قطعہ لکھ کر جواب دیا:۔

يقولون قد قل مذهب احمد — وكل قليل فى الانام ضئيل

وہ کہتے ہیں مذہب احمد کے پیرو کم ہیں — اور جو لوگ دنیا میں کم ہوتے ہیں وہ کمزور رہتے ہیں

فقلت لهم مهلا غلطتم بزعمكم — الم تعلموا ان الكرام قليل

میں نے جواب دیا ٹھیرو تمہارا خیال غلط ہے — کیا تم نہیں جانتے کہ شریف لوگ تھوڑے ہوتے ہیں

وما ضرنا انا قليل وجارنا — عزيز وجار الاكثرين ذليل

قلت تعداد سے ہمیں نقصان نہ ہوا۔ کیونکہ ہمارا پڑوسی سربلند و معزز ہے اور زیادہ لوگوں کے پڑوسی ذلیل ہوتے ہیں۔

مذہب حنبلی کے وسیع نہ ہونے کے اسباب مختلف لوگوں نے مختلف بیان کئے ہیں۔ مگر اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل تمام ائمہ کے آخر میں آئے ان سے قبل حنفیت۔ شافعیت اور مالکیت عالم اسلام میں اپنی جگہ بنا چکی تھیں۔ دوسرے مذاہب کے مفتی اور قاضی حکومت کے دربست پر پہلے سے قابض تھے اور عامۃ الناس انہی کے فیصلوں پر عمل کرتے۔ اور انہی کے مسلک پر عامل ہو

چکے تھے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ امام احمد اور ان کے متبعین سرکار دربار سے دور رہتے تھے۔ اور حکومت و اقتدار کے مناصب سے اجتناب کرتے تھے۔ اس کے برعکس حنفیت کو عراق میں اس وقت زیادہ فروغ حاصل ہوا جب امام ابو یوسف قاضی القضاۃ ہوئے اور پورے ملک میں حنفی قاضیوں کا عمل دخل ہو گیا۔ اسی طرح مالکیت اندلس میں اور مغرب میں اسوقت پھیلی۔ جب کہ مالکیت وہاں کا سرکاری مذہب بن گئی۔ لیکن حنبلی علماء امام احمد کی پیروی میں حکومت اور اس کے مناصب سے دور بھاگتے تھے۔ اس لیے حنبلیت عوام میں نہ پھیل سکی۔ بلکہ وہ خواص کا مذہب بن کر رہ گئی۔

تیسری وجہ حنبلیوں کی تشدد پسندی بھی تھی۔ تشدد ہمیشہ کشمکش کو بڑھاتا اور مذہب کے سامنے کاؤنٹر کھڑی کر دیتا ہے۔ حنابلہ کی عادت ہو گئی تھی کہ ان سے ذرا کسی نے اختلاف کیا یا کوئی بحث کی تو وہ اس پر برس پڑتے اور اسے اپنی مجلس سے نکال دیتے۔

دوسرے فرقوں کے خلاف بھی ان کا تشدد بہت بڑھا ہوا تھا۔ چوتھی صدی ہجری میں ان کی قوت و شوکت معراج کمال پر تھی۔ کامل بن اثیر کا بیان ہے کہ ۳۲۳ھ میں وہ اتنے زور میں تھے کہ سرکاری حکام اور عام لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے۔ اگر نبیذ پاتے تو اسے نالی میں بہا دیتے۔ اگر کسی مغنیہ کو دیکھتے تو اسے مارتے اور اس کے آلات غنا توڑ پھوڑ ڈالتے۔ خرید و فروخت میں دخل دیتے۔ اگر کوئی مرد کسی عورت یا لڑکے کے ہمراہ جاتا ہوا دیکھتے تو اس سے پوچھتے

یہ تمہارے ساتھ کون ہے اور تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے۔ اگر وہ بتا دیتا تو بہتر ورنہ اسے پیٹتے۔ اسے تھانے لے جاتے۔ اور اس پر بدکاری کا الزام لگاتے۔ جب بغداد میں ان کی شورش بہت بڑھ گئی تو بغداد شہر کا کوتوال شہر لے۔ اجمادی الاخری کو سوار پولیس کی جمعیت لے کر نکلا۔ اور اس نے ابو محمد بربہاری حنبلی کے آدمیوں کے متعلق فرمان صادر کر دیا کہ دو حنبلی بھی ایک جگہ جمع نہ ہوں اور نہ اپنے مذہب کا مناظرہ کریں۔ اور نہ امام کے ساتھ نماز پڑھیں۔ بجز مغرب عشاء اور صبح کی نماز کے۔ لیکن اس فرمان کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بلکہ اُن کا شر و فساد زیادہ ہو گیا۔ اور حکومت اور عوام اُن کے دشمن ہو گئے۔

بہر حال مذہب حنبلی سب سے اول عراق سے شروع ہوا۔ یہاں سے ماوراء النہر پہنچا۔ بغداد میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ سب پر غالب تھا۔ لیکن حنبلیوں کی شدت پسندی اور تنگ نظری نے اس کو محدود کر دیا۔

مصر میں اس کے قدم ساتویں ہجری میں جمے۔ کیوں کہ اس سے پہلے وہاں دولت فاطمیہ کے باعث شیعیت کا دور دورہ رہا تھا۔ اس کے بعد ایوبی آئے جو شافعی تھے۔ اور جب دولت ایوبی کمزور ہوئی تو مذہب حنبلی کو بھی جگہ ملی مگر عام لوگوں تک اس کی رسائی نہیں ہوئی۔ حنبلی مذہب کے علماء زیادہ تر دمشق میں رہے اور وہیں وہ علمی کام کرتے رہے۔

لیکن عہد حاضر میں مذہب حنبلی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص مواقع اشاعت کے عطا ہوئے۔ نجد میں آل سعود نے حنبلیت اختیار کی اور جب اس کا قبضہ حجاز پر بھی ہو گیا۔ تو مذہب حنبلی عرب کا سرکاری مذہب ہو گیا۔ اور اسی کے مطابق

پورا نظام حکومت چلنے لگا۔ چنانچہ اب یہ مذہب گھر کی چار دیواری میں محدود نہیں۔ بلکہ تعزیرات۔ معاملات اور مالیات سب مذہب حنبلی کے مطابق انجام پا رہے ہیں۔ ربا کلی طور پر حرام و ممنوع ہے۔ صدقات اسلامی وصول کیے جاتے ہیں۔ اور عشر، زکوٰۃ اور تجارت کے محصولات شریعت کے مطابق جمع کیے جاتے ہیں۔ سعودی عرب میں شرعی حدود کے نفاذ کے باعث اتنا امن ہے کہ صحرائے عرب میں کوئی چیز کھوئی جائے تو دو تین روز کے اندر اس کے مالک کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

بسم اللہ

○ کتاب کوئی ایسی زیادہ impressive نہیں ہے +
○ اس کی ترتیب و تنظیم میں بھی خامیاں ہیں۔
○ یہ دراصل مصنف کا "حاصلِ مطالعہ" ہے، غالباً ایک مستقل کتاب مرتب کرنا ان کے پیشِ نظر نہ تھا

رفیع الدین ہاشمی

سرگودھا ★ ۳۱ جنوری ۱۹۷۳

تحریکِ مجاہدین کا
انقلابی پہلو
از
اسعد گیلانی
سید احمد شہید اور اُن کے ساتھیوں نے اللہ کی راہ میں کس کس نوعیت کی قربانیاں
پیش کیں اور جب راہِ حق پر گامزن ہوئے تو اپنے مالک کے مطالبے پر کیا کچھ لٹا دیا۔ مقصدِ زندگی کو سربلند کرنے
کے لئے انہوں نے — ● گھر بار چھوڑ دیے — ● عزیز و اقارب چھوڑ دیے۔
● زمینیں اور جائدادیں، کھیتیاں اور باغات چھوڑ دیے — ● زر و جواہر اور مال و دولت لٹا دیے
● پھر صحرا اور بریلے پہاڑ چھان ڈالے — اور جب مالک نے مزید مطالبہ کیا تو اس کی
راہ میں ● خون بہا دیا — گردنیں کٹا دیں — اور
آخری ہدیہ — ● نقد جان بھی پیش کر دی
اس دل گداز اور جاں گسل کشمکش کی درد ناک داستان — اسعد گیلانی
نے اپنے دلآویز تحریکی انداز میں بیان کی ہے
صفحات ۲۶۰ — قیمت تین روپے
ناشر
بہ تعمیرِ انسانیت موچی دروازہ لاہور